عبادت

کہانیوں کا مجموعہ

6.12.08

اِندرا شبنم

اسباق پبلی کیشنز، پونہ - سلسلۂ مطبوعات 56

کتاب کا نام : عبادت (کہانیوں کا مجموعہ)

مصنف : اندرا شبنم

گھر کا پتہ : B-9، میور بن اپارٹمنٹ،
1100، شیواجی نگر، پونے 016 411

سنِ اشاعت : ۲۰۰۶ء

تعدادِ اشاعت : ۵۰۰

قیمت : ۱۰۰؍ روپے

کمپیوٹر کمپوزنگ : مدنی گرافکس، پونے (26122855)

زیرِ اہتمام : اسباق پبلی کیشنز، پونے
'Saira Manzil', 203/B/102,Viman Darshan,
Sanjay Park, Lohgaon Road, Pune 32

Ibadat

A collection of stories

by

Indira Shabnam

Asbaque Publications, Pune

2006 *Rs. 100/-*

فہرست

*

محترمہ اندرا شبنم ایک ہمہ جہت فنکارہ ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک اچھا شاعر اچھا افسانہ نگار بھی ہو۔ یہ خوبی قدرت کے خزانے سے اندرا شبنم کو میسر آئی ہے۔ احساسات و تصوّرات کی روح پرور اور مسرورکن دنیا میں رہنے کے بعد بھی آپ نے حقائق کی سنگلاخ زمینوں سے اپنا رشتہ ہمیشہ مضبوط رکھا۔ زندگی کی تلخیوں، حالات کی سفاکیوں، معاشرے کی بے اعتدالیوں اور انسانیت کی تنزل پذیری نے بساطِ جہاں پر جو منظر نامہ مرتب کیا ہے اندرا شبنم نے ان سبھی کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ یہ کہانیاں آپ کو زندگی کے اندھیروں اور اُجالوں سے ملاتی ہیں۔ ان کہانیوں میں قارئین کو اپنے پن کا شدید احساس ہوتا ہے۔ یہی احساس ان کہانیوں کی پہچان ہے اور ان کی کامیابی کا راز بھی ہے۔ میں ان کہانیوں کی اشاعت پر اندرا شبنم کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

نذیر فتح پوری

اندرا شبنم کی "عبادت"

قاضی مشتاق احمد

اُردو افسانوی ادب کے اہم ستون منشی پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور سعادت حسین منٹو ہیں۔ اُردو ادب میں جب بھی افسانوں کا ذکر آتا ہے بات انہی سے شروع ہو کر انہی پر ختم ہو جاتی ہے۔ بعض کوتاہ ذہن ناقد یہ تاثر بھی دیتے ہیں کہ افسانوی ادب کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دراصل یہ افسانوی ادب میں بہار کا موسم ہے۔ آج بھی بہت اچھے افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ اِندرا شبنم کی "عبادت" اسی دعویٰ کا ایک پختہ ثبوت ہے۔

اِندرا شبنم ایک حساس فنکارہ ہیں۔ ان کے لیے ظلم، زیادتی اور ناانصافی کا تماشہ کھلی آنکھوں سے دیکھنا ممکن نہیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنے قلم کو تلوار بنا کر ان زیادتیوں کے خلاف آواز اُٹھائی ہے لیکن ان کی کہانیوں میں کہیں بھی نعرہ بازی یا جھنجھلاہٹ نہیں، بلکہ سرگوشیوں کا انداز ہے۔ کُنین کو شکرپاروں میں لپیٹ کر یہ پیغام دیا گیا ہے کہ ۔

اِندرا نے معاشرہ کی بدلتی تصویر کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ پچّیس برس تک وہ پیشۂ درس و تدریس سے وابستہ رہیں۔ ایروڑہ جیل میں لیڈیز وارڈ کی وارڈن بھی تھیں۔ محکمۂ پولیس میں بھی انھوں نے کام کیا۔ شاعری کو بھی انھوں نے اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ مہذب معاشرہ میں شاعری اور افسانہ نگاری اظہار کے مؤثر ذرائع ہیں۔ گراہم گرین نے لکھا ہے کہ "لکھنا ایک قسم کا علاج معالجہ ہے۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ وہ لوگ جو نہیں لکھتے کیسے دیوانگی، مالنخولیا اور خوف سے محفوظ رہ سکتے ہیں جو انسانی فطرت میں داخل ہیں"۔

اِندرا نے ملک کی تقسیم کی تباہیوں کو نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بلکہ اس درد کو سہا ہے بھی۔ ان کی ایک کہانی "تتر بتر" درد کے معراج کی منہ بولتی تصویر ہے۔ "عبادت" میں آپ کی ملاقات ایسے کئی کرداروں سے ہوگی جو سچ بولتے ہیں اور سچ کے علاوہ اور کچھ نہیں بولتے۔ اِندرا نے سماج کے مسائل کی نشاندہی بھی کی ہے اور یہ سبق بھی دیا ہے کہ اگر خواتین کی تعلیم کو پیشہ ور تربیت سے جوڑا جائے اور سماجی لحاظ سے انھیں آزاد اور مالی اعتبار سے خود انحصار بنایا جائے تو خواتین خود اپنی مشکلات کا حل تلاش کر سکتی ہیں۔ ڈھول اور جانور کی طرح "مارن کی ادھیکاری" بنانے کی بجائے اسے معاشرے میں باعزت مقام دینا بھی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

اِندرا شبنم گھریلو زندگی میں بھی بے حد خوش ہیں۔ اپنے غم کو اپنے سینے میں چھپا کر ہر دم مسکراتے رہنا کوئی آسان کام نہیں۔ اپنے آبائی وطن سے بچھڑ جانے کا غم، زبان کا اکیلا پن، اپنوں سے دور ہونے کا غم، اتنی سی عمر میں انسان کیا کیا صدمے برداشت کرے؟ اندرا نے تجربات و حوادث کی شکل میں یہ سب صدمے برداشت کیے۔ 'ریاضت' کو 'عبادت' کا درجہ دیا اور تجربات کے 'شبنمی قطروں' سے دل کا دامن بھر لیا۔ ان 'قطروں' کو وہ 'کتابوں' کی صورت میں واپس لوٹا رہی ہیں۔ "عبادت" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اُمید کہ اِندرا شبنم کی عبادت کو عوامی حلقوں میں شرفِ قبولیت حاصل ہوگی اور شائقینِ ادب سے "توہینِ عبادت" کا گناہ سرزد نہیں ہوگا۔ اِندرا نے کہا ہے ۔

میری نیک خواہشات اِندرا شبنم کے ساتھ ہیں۔ اس سے پہلے اندرا شبنم کی کتابیں ہندی، انگریزی، مراٹھی اور سندھی زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اُردو زبان میں یہ ان کی دوسری کتاب ہے جس کا اُردو افسانوی ادب میں یقیناً خیر مقدم ہوگا۔

تعارف

نام : اِندراپوناوالا (شہداد پوری) عرفیت: "اِندو" تخلص : شبنم

پیدائش : ۲۴رنومبر۔ بمقام کراچی (سندھ)

تعلیم : بی.اے، بی.ایڈ، ساہتیہ رتن سینئر سند (ہندی)

مطبوعہ تصانیف :

❖ شبنمی قطرہ (غزلیں، آزاد نظمیں) سندھی ❖ عبادت (کہانیوں کا مجموعہ) ہندی، سندھی

❖ سلن جو سکھ (مجموعۂ کلام) سندھی ❖ تصویریں (آزاد نظمیں) ہندی

❖ سرگوشیاں (غزلوں کا مجموعہ) ہندی ❖ سلسلے (آزاد نظمیں) ہندی

❖ سرگوشیاں (غزلوں کا مجموعہ) اُردو ❖ سرگوشیاں (مجموعہ کلام) ہندی

دیگر مصروفیات : ❖ ٹی وی اور ریڈیو پر پروگرام۔ ❖ سندھی، ہندی، مراٹھی اور اردو میں نثرنگاری اور مشاعروں میں شرکت۔ ❖ بھوپال، ممبئی، رائے پور، دلی اور دیگر شہروں میں سندھی، ہندی، مراٹھی اور اردو مشاعروں اور افسانہ خوانی کی نشستوں میں شرکت۔ ❖ تقریباً تمام ادبی رسالوں میں چاروں زبانوں میں تخلیقات چھپتی رہتی ہیں۔

آئندہ تخلیقات: ناول، غزلیں، نظمیں (سندھی اور مراٹھی میں)، ہندی (مجموعۂ کلام)۔

مشاغل : ❖ اٹھائیس سال تک معلّمہ۔ ایک سال تک ایروڈا جیل کی لیڈیز وارڈ کی وارڈن۔ ❖ ایک سال تک محکمہ رُورَل پولیس میں مجرموں کی چھان بین۔ ❖ ایس ایس وائی یوگا کی ہیڈ مسٹریس اور منتظمہ۔ ❖ ریکی ماسٹر۔

❖ روحانی معالجہ

قابلِ ذکر انعامات: ❖ دلی سندھی اکیڈمی سے سندھی زبان میں مجموعۂ کلام "شبنمی قطرہ" پر اکیس ہزار روپے کا اِنعام۔ ❖ ہماچل پردیش سے "عبادت" ہندی کتاب پر انعام۔ ❖ بروڈا (گجرات) این.سی.پی.ایس.ایل کی طرف سے سندھی کہانیوں کے مجموعے 'عبادت' پر بیس ہزار روپے کا انعام۔ ❖ کولہاپور اَدھیویشن میں ہندی ادب میں خدمات کیلئے A.I.P.C. کی جانب سے ایک ہزار روپے، شال، توصیفی سند، مومنٹو دے کر اعزاز کیا گیا۔

❖ دہلی ساہتیہ اکادمی سے 'ویرانگنا ساوتری بائی پھلے' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ❖ ہندی مجموعہ کلام 'سلسلے' پر "مہادیوی ورما" ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ❖ اسکولوں اور کالجوں کی نصابی کتابوں میں آپ کی تخلیقات شامل ہیں۔

رابطہ : 1100، ماڈل کالونی، B - 9، 'میور بن' اپارٹمنٹ، شیواجی نگر، پونے 411 016

فون نمبر : 25671039, 25652825

□□□

عبادت

دروازے پر کسی کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا تو باہر پوسٹ مین کھڑا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ میں ایک رنگین لفافہ دیا جس سے بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ میں نے بے صبری سے پتہ دیکھا۔ کچھ جانے پہچانے حروف تھے۔ بھیجنے والے کا نام اور پتہ نہیں لکھا تھا۔ ایسے لفافے مَیں بچپن سے دیکھتا آرہا تھا۔ ایسی تحریر دیکھ کر من میں ایک عجیب سی بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس وقت بابا غسل کر رہے تھے۔ وہ جلدی میں باہر آکر مجھ سے پوچھنے لگے "کون تھا؟ پوسٹ مین؟" شاید وہ تولیہ سے جسم پونچھ رہے تھے۔ شرارت میں بھر کر، بڑی ہی ہوشیاری سے میں نے کہا "خط آیا ہے"۔

"آتا ہوں، آتا ہوں ٹیپائے پر رکھو" اتنا کہہ کر وہ میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

لفافہ لے کر صرف پتے پر نظر ڈالتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کتنے ہی سالوں سے یہی سلسلہ چلا آرہا تھا۔ ہر بار ایک سارڈ عمل تھا۔ بچپن سے جوانی تک یہ کھیل تو میں خاموش تماشائی بن کر دیکھتا آرہا ہوں لیکن آج نہ جانے مجھ پر کون سی دل لگی سوار ہوئی تھی۔ بچپن کا تجسس مجھ سے آج یہ کیا کروارہا تھا، میں بابا کے کمرے کے پاس جاکر دروازے کے 'کی ہول' سے اُن کی ہر حرکت دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ خط پڑھتے وقت کبھی سنجیدہ ہو جاتے یا دل تھام کر پڑھتے، یا ان کے چہرے پر کبھی مسکان چھا جاتی۔

میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور پھر سے 'کی ہول' سے اُن کے چہرے کو دیکھا تو ایسے لگا کہ کسی

نے سمادھی کی حالت سے ان کا دھیان بھنگ کر دیا ہو۔

مجھے لگا کہ میں نے کچھ غلطی کی۔

"بابا میں ہوں! مجھے غسل کرنا ہے اور غلطی سے میں کپڑے اندر بھول گیا ہوں۔ کالج جانے میں مجھے دیر ہو رہی ہے"۔

میں نے دیکھا، آواز سن کر بابا نے وہ لفافہ جھٹ سے گادی کے نیچے رکھ دیا اور منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چپکے سے دروازہ کھولا۔

میں نے اَنجان بنتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ اندر جا کر اِدھر اُدھر نظر ڈالتے ہوئے کہا "ساری بابا! یہاں تو تولیہ نظر نہیں آرہا ہے۔ میں ڈھونڈ تا ہوں" اتنا کہہ کر میں کمرے کے باہر نکل گیا۔

بابا نے پھر سے دروازہ بند کر لیا۔

بابا کی اس عادت کے بارے میں بچپن میں ہی ماں نے مجھے بتایا تھا۔ بابا جب کبھی کہانیاں یا ناول پڑھتے ہیں تو دروازہ بند کرنے کی ان کی پرانی عادت ہے۔ ماں کے خود اَن پڑھ ہونے سے بابا کے تعلیم یافتہ ہونے کا اسے بڑا فخر تھا۔ ہم بچوں کو بھی اُس نے کہہ رکھا تھا کہ جب دروازہ بند ہو تب اُنھیں تنگ نہ کرنا۔

مجھے یاد آنے لگی، میری بھولی بھالی ماں اور اس کی ڈانٹ پھٹکار! لیکن آج نہ جانے مجھ پر کون سا بھوت سوار تھا۔ کسی نہ کسی بہانے آج بابا کو ستانے کے خیالات دل میں بار بار اُٹھتے رہے۔

آج میرا من بے چین تھا۔ کالج، کلاس، کینٹین، پڑھائی، کتابیں، کہیں بھی میرا من نہیں لگ رہا تھا۔ دس بارہ سالوں سے من میں اُبھرنے والے تجسس کو آج میں دبوچ نہیں پا رہا تھا۔ گھر لوٹنے کے خیال سے ہی من کو راحت ملی۔ گھر آکر دیکھا تو بس! میں اکیلا ہی تھا گھر میں۔ بابا تو شام کو آئیں گے۔

میں بابا کے کمرے کی طرف مڑا۔ ان کی کتابوں کی الماری تھی۔ وہاں پاس ہی کے ڈرایر میں تالا لگا ہوا تھا۔ ضرور یہاں کچھ خاص بات ہوگی۔ میں کنجی ڈھونڈنے لگا۔ آخر کنجی ملی تو بابا کے بچھونے کے نیچے۔

کنجی لے کر تالا کھولا تو چندن کی مہک آئی۔ وہاں پر تازہ گلاب کی پنکھڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی پوجا گھر میں داخل ہوا ہوں۔ بہت ہی خوبصورتی سے وہ خطوط اکٹھے باندھ کر رکھے ہوئے تھے۔ وہاں رنگین لفافے، وہی صاف ستھری خوشخطی۔ اُس مہک سے میں مدہوش ہو اُٹھا۔ لیکن اُن خطوط کو دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ جیسے کسی نامعلوم طاقت نے میرے ہاتھ باندھ دیے تھے۔

میرے چنچل من نے مجھے اکسایا اور خطوط کا ایک پرانا گٹھا میں نے اُٹھالیا۔ ایک خط نکال کر دیکھا۔ وہ محبت نامہ تھا۔ اس خط میں ''جنم جنم کا ساتھ'' جیسے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ نیچے ایک عورت کا نام اور تصویر تھی۔ اُس معصوم چہرے پر پاکیزگی کے آثار نظر آرہے تھے۔

میرے ہاتھ سے وہ تصویر چھوٹ گئی۔ تبھی دروازہ پر کسی نے گھنٹی بجائی۔ میں چونک گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ جلد بازی میں وہ خط رکھ کر میں دروازہ کھولنے بھاگا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ اس وقت بابا نہ آئے تو اچھا ہوگا۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے دروازہ کھولا۔ باہر دھوبی کھڑا تھا۔ میں نے کپڑے لے کر پھر سے دروازہ بند کیا۔ میرے جسم میں ایک دم تکان محسوس ہوئی۔ میں پلنگ پر لیٹ گیا۔

من میں صرف خیالات...... میرے بابا کسی غیر عورت کی محبت میں......؟ میری ماں بہت ہی بھولی بھالی، اَن پڑھ، شوہر کو ایشور ماننے والی، بابا کو ہمیشہ ایک آئیڈیل اور ایک اچھے شوہر کے روپ میں جان کر آج تک زندگی بتا رہی ہے اور بابا زندگی بھر اُسے دھوکہ دیتے رہے؟ اس ڈھلتی عمر میں بھی میری ماں کو ٹھگنے والا میرا باپ...... جوانی میں ماں نے کون کون سی باتیں برداشت کی ہوں گی؟ کیا کچھ نہیں برداشت کیا ہوگا؟ ہائے!...... میں اُس خط کو نہیں بلکہ کسی آتش فشاں کو چھو لیا تھا۔

اپنے خیالات کو دور ہٹانے کے لیے میں ایک کتاب پڑھنے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہی تحریر گھوم رہی تھی۔ وہ خط احمد آباد سے آیا ہوا تھا۔ میرے چچا وہاں رہتے تھے۔ میرے بابا ایک دو مہینے کے بعد اُنھیں ملنے جاتے رہتے تھے۔ پھر اس عورت کو بھی ملتے ہوں گے؟ شاید اُن کے دو گھر...... دو پریوار ہوں گے؟ میرے دل میں اُن کے لیے نفرت کا جذبہ پیدا ہوا۔

کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دیکھا ماں لوٹی تھی۔

"ارے، بتی کیوں نہیں جلائی؟ تمہاری آنکھیں لال کیوں ہو رہی ہیں؟ کیا بابا اب تک نہیں آئے؟ پیدل چل کر بہت تھک گئے ہوں گے۔ اُنھیں اپنی طبیعت کا خیال کہاں رہتا ہے؟ میری سنتا کون ہے؟"

مجھے ماں کی معصومیت پر ترس آیا اور غصہ بھی۔ بنا کچھ سوچے سمجھے میرے منہ سے الفاظ تیر کی طرح نکل گئے "ماں، تم پڑھی لکھی کیوں نہیں؟"

"بیٹا، گرومکھی تو آتی ہے نا؟ مجھے کیا بیرسٹر بننا تھا؟ گھر گرہستی کے کام میں تعلیم کا ہونا کیا اتنا ضروری ہے؟ لیکن آج تو یہ سب کیوں پوچھ رہا ہے؟"

میں ہڑبڑا کر رہ گیا۔

"یوں ہی پوچھا ماں! تم بہو لاؤ گی تو بتاؤ وہ پڑھی لکھی ہو گی یا اَن پڑھ؟"

ماں ہنسنے لگی۔

"بہو تو تیری پسند کی ہو گی" اتنا کہہ کر ماں رسوئی گھر میں چلی گئی۔

میں من ہی من سوچنے لگا، 'ماں، اگر تم پڑھی لکھی ہوتی تو...... میرے خیالات آدھے ادھورے رہ گئے کیونکہ بابا آرہے تھے۔

آج میں نے بابا کو کچھ الگ نظریہ سے دیکھا۔ بابا اپنی اصلی عمر سے کچھ کم نظر آرہے تھے۔ خوبصورت، پرکشش، سڈول جسم اور چہرہ...... اُن کی شخصیت سے آج تک میں متاثر رہا۔ اُن کے اوصاف کا مداح رہا۔ لیکن آج وہ مجھے بہت چالباز نظر آئے۔ کسی فلم کے ولین نظر آئے۔

اُس کے بعد ہمیشہ کی طرح ماں اور بابا کے بیچ گپ شپ شروع ہوئی۔

"چائے تو پلاؤ بھئی، میں تو بڑا قسمت والا ہوں۔ تیرے ہاتھ کی چائے پی کر تو میں ہمیشہ جوان دِکھائی دیتا ہوں"۔

شرم آگیں لہجے میں ماں بولی "کیسی بات کرتے ہو؟ اب بیٹا جوان ہو گیا ہے۔ نانا بن گئے ہو لیکن شرارت نہیں چھوڑتے"۔

ہلکے سے گردن کو جھٹکا دے کر ماں وہاں سے نکل گئی۔

آج بابا مجھے 'نقلی ہیرو' کی طرح لگ رہے تھے۔ میں نے من ہی من میں کہا، 'ڈبل رول!'

آج تک میں اپنے دوستوں سے بابا کی تعریف کرتے نہیں تھکتا تھا۔ ماں اور بابا کا پیار میرے لیے ایک مثال تھا۔ ان کی شخصیت، ان کی کامیابی، سمجھداری، علم، دانشوری مجھے ہمیشہ متاثر کرتی رہی۔ میں انھیں اُستاد مان کر اپنے آپ کو ان کا شاگرد مانتا تھا۔ ان کا صبح جلدی اُٹھنا، ورزش کرنا، تانبے کے پیالے میں پانی پینا، کسرت سے بنا سڈول جسم، دل کو لبھانے والا پرکشش لباس، فیصلہ لینے کی صلاحیت، ہوشیاری، سہگل کے مدھر گیتوں کو گنگنانا، ہر موضوع میں دلچسپی...... اِن سبھی باتوں سے میں ایک مقناطیس کی طرح اُن کے پاس کھنچا جاتا تھا۔

یہی میرے محبوب اور مثالی بابا کسی غیر عورت سے ناطہ رکھتے ہیں؟ اتنے سالوں سے؟ لیکن میرے بابا ایسے نہیں۔ اُسی عورت نے اپنے جال میں اُنھیں پھنسایا ہوگا۔

بس، من میں اب ایک ہی خواہش اُبھر رہی تھی کہ وہ سارے خط پڑھ کر اس عورت کو ایک خط لکھوں۔ ڈانٹ پھٹکار کے ساتھ لکھوں کہ "اتنے عمر دراز مرد کو جو ایک جوان بیٹے اور ایک شادی شدہ لڑکی کا باپ ہے، جلدی ہی اب دادا ہونے والا ہے، اُنھیں غلط راستے پر لے جانے کا تمھیں کیا حق ہے؟"

دوسرے ہی دن سے میں موقعہ ڈھونڈنے لگا کہ کب میں اکیلا رہوں اور اپنے دل کے تجسس کو شانت کروں...... اور ایک دن مجھے موقعہ مل ہی گیا۔ وہ الماری کھولی۔ دو، تین دن پہلے جو خط آیا ہوا تھا اسے اُٹھا کر میں پڑھنے لگا......

تمہارا بیٹا انجینئرنگ کے آخری سال میں ہے، یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ محنت کا پھل ملا۔ آپ نے خط میں لکھا ہے کہ یہ میری مہربانی ہے۔ آپ کا یہ کہنا مجھے پسند نہیں۔ ڈونیشن کے لیے بھلے ہی میں نے پیسے دیے ہوں لیکن محنت تو اسی کی ہے۔ تمہارا بیٹا میرا بھی تو بیٹا ہے نا! ہمیں ملے بارہ سال بیت چکے ہیں۔ گھر سنسار کے اس چکر میں پتہ ہی نہیں چلا کہ اتنے سال کیسے گزر گئے؟ میری دونوں لڑکیوں کی شادیاں ہوئیں۔ اب اکیلاپن محسوس کرتی ہوں اور میری طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں رہتی۔ بھگوان کی مہربانی سے اگر ایک لڑکا ہوتا تو مجھے بھی بہو آجاتی۔ اکیلے پن میں دل نہیں لگتا۔ تم تو بڑے نصیب والے ہو۔ تمہارے بیٹے کے ہاتھوں تمہارا انتم سنسکار ہوگا۔

آگے میں پڑھ نہیں سکا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں کتنا گنہگار ہوں۔ بزدل ...... میں اپنے من کو کوس رہا تھا۔ دو پریمیوں کی عبادت میں خلل ڈالنے والا میں ...... جو اَنگنت برسوں سے نہیں ملے۔ ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں اور اس پر اتنی بے انتہا عقیدت اور اپناپن۔

میرا من بابا کے تئیں اور اُس اَنجان عورت کے تئیں عقیدت سے بھر گیا۔ اُن کے لیے محبت کے جذبات پیدا ہوئے۔ اسے کیا کہیں، محبت یا عبادت؟...... آج میں انجینئر بھی اُسی کی وجہ سے بنا۔

پورا خط پڑھنے میں میرا من نہیں لگا۔ مذہبی گرنتھ مان کر وہ سبھی خط میں نے رکھ دیے۔

اُس دن کے بعد جب جب وہ رنگین لفافے آتے، اُنھیں بابا کو پڑھتے دیکھ کر، میرا دل فخر سے بھر جاتا۔ اُن کے روشن چہرے کو میں دیکھتا رہ جاتا۔

ایک دن پوسٹ مین نے آکر 'تار' ہاتھ میں سونپ دیا۔ احمد آباد سے اسی عورت کے شوہر نے بھیجا تھا، میرے بابا کے نام لکھا تھا:

"اُسی موت ہو گئی۔ اُس کی آخری خواہش تھی کہ آخری سفر میں آپ شامل ہوں۔ جلدی آیئے گا"۔

پڑھ کر میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ بابا کے کمرے میں جا کر اُن کے ہاتھ میں تار سونپا اور اپنے ہاتھوں سے میں دروازہ بند کیا۔

اتنی ہمت والا آدمی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آواز سن کر ماں دوڑی آئی تو میں نے ماں سے کہا:

"بابا کے ایک دوست احمد آباد میں گزر گئے ہیں۔ بیگ میں سفید کپڑے بھر دو۔ ہم دونوں کو جانا ہے"۔

بابا حیرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتے رہ گئے۔ میں نے اُن کندھوں پر ہاتھ رکھا، اُنھیں گلے سے لگایا۔ مانو اُن کا درد چوسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اُن کا دکھ بانٹ لیا تھا۔

ہم احمد آباد پہنچے۔ اُس دیوی کے درشن کیے۔ عقیدت بھرا نمسکار کیا۔ بابا کو اُن کا دیدار کرایا۔ بابا اور اُس کے شوہر گلے مل کر ایک دوسرے کو تسلی دی۔ دونوں کے دلوں میں غم کا اتھاہ

سمندر بھرا تھا۔

ایک کو سب کچھ پاکر کچھ نہیں ملا تو دوسرے نے سب کچھ کھو کر سب کچھ پایا۔ کتنا فرق تھا دونوں میں۔

ایسا لگ رہا تھا کہ ان دونوں کی یہ پہلی ملاقات نہیں ہے بلکہ برسوں سے وہ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔

آخری رسومات میں نے ہی ادا کیے۔ پگڑی کی تعزیتی مجلس میں ہم نے وداعی لی۔

"بابا اُٹھو، اپنا شہر آ گیا ہے" راستے بھر بند اُن کی آنکھیں اب کھلی تو اُن نظروں میں بیحد غم تھا۔

میں نے کہا "بھگوان کی رضا پر راضی رہنا ہی سچی زندگی ہے، ہے نہ بابا......"

بابا کچھ نہیں بولے، بس گردن ہلا دی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔



پُروا کا موڑ

آج میرا دل بے قرار ہے۔ ملن کی گھڑی قریب آ پہنچی ہے۔ انتظار کی گھڑی ختم ہو چکی ہے۔ آج...... آج...... وہ آنے والا ہے۔ 'وہ' جسے میں دل دے بیٹھی ہوں۔ اس کا وجود، اس کی عادتیں، اس کا مزاج میری شخصیت کے اندر سما گیا ہے۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں اس سے ملن کے سوائے جیسے کچھ تھا ہی نہیں۔ میری زندگی کا پل پل اس کے لیے قربان ہے۔

اُس دن اخبار میں 'قلمی دوست' کالم میں اس کا نام اور پتہ دیا ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر میری بیٹی رَچنا دوڑ کر میرے پاس آئی اور کہنے لگی

"دیکھو، دیکھو مما! اس آدمی کی پسند ٹھیک تم سے ملتی جلتی ہے۔ یہ ادب دوست ہے۔ قدرتی مناظر، مصوّری اور خوبصورتی کا دلدادہ ہے۔ سنجیدہ خیالات کا، مراقبہ اور محاسبہ کرنے والا ہے۔ پرانی فلموں کے گیت نیز غیر فلمی گیتوں کا چاہنے والا ہے۔ گیت گنگنانے میں بھی اس کی دلچسپی ہے۔ ممی، بس تم اپنا نام اور پتہ جھٹ سے لکھ دو......"

میں نے رَچنا کا کان پکڑ کر پوچھا "اری، یہاں عمر کا ذکر کیا ہے یا نہیں؟"

"جو ایسے اعلیٰ خیالات والا، سنجیدہ اور دانشور ہو وہ کوئی بچہ تو نہیں ہو سکتا۔ تمھیں اپنے تبادلۂ خیال کے لیے دوست چاہیے تھا نا، ہاں، اب ہچکچانا مت"۔

اس نے خط لکھا۔ اس کا جواب بھی فوراً آیا۔ پھر تو جیسے دونوں طرف سے خطوں کی بوچھار ہونے لگی۔ دونوں کی چاہ ایک تھی۔ پیاس ایک تھی۔ دونوں کو امرت پلانے والا ذریعہ ملا۔ پیاسے دلوں کو راحت ملی کیونکہ دونوں کی پسند ایک جیسی تھی۔

مجھے بچپن سے ہی ناچ، موسیقی، مصوری اور ادب کا شوق رہا ہے۔ بے شمار ایوارڈز بھی حاصل ہوئے۔ کالج سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد فوراً ہی میری شادی ہوئی تھی۔ پتاجی نے بڑے خاندان کا اچھا داماد ڈھونڈا۔ میرے پتی کا بڑا کاروبار تھا۔ میرے پاس سب کچھ تھا۔ سبھی سہولتوں سے مزین میرا گھر جس میں عیش و آرام کی سبھی چیزیں میری خدمت میں موجود تھیں۔ کمی تھی تو بس ایک ہی بات کی۔ شاعری، موسیقی اور کلا کی۔ میرے پتی رئیس آدمی تھے، مانو پیسہ کمانے والا ایک آلہ۔

اُس گھر کی بہو کی زندگی میں رسوئی سنبھالنا، کشیدہ کاری اور گہنوں کے علاوہ کسی اور بات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

ایسے روکھے ماحول میں میرا من مرجھا گیا۔ من کی کلی کبھی کھل نہیں تھی۔ کہاں گئے وہ چاند تارے، پھول شبنم، پربت، جھرنے، لے تال، میری زندگی میں انھیں پھر سے لانا ناممکن تھا۔

میں نے دو پیارے سے بچوں کو جنم دیا۔ بچے تو کومل پھول کی طرح تھے۔ میرے دکھی من کو تھوڑی شانتی ملی۔ میری محبت سے خالی زندگی میں تبدیلی آئی اور میرے پاؤں زمین پر پڑنے لگے۔ میرے سمٹے ہوئے آکاش میں اُمیدوں کے اَنگنت ستارے ٹمٹمانے لگے۔ بچوں میں دن خوشی سے گزرنے لگے تھے۔

اچانک! میری زندگی سے خوشی نے منہ موڑ لیا۔ ایک حادثے میں میرے پتی کا دیہانت ہو گیا۔ اب ان کا کاروبار سنبھالنا اور بچوں کی پرورش کی ذمہ داری مجھ ہی پر آن پڑی۔ بچوں کی ماں اور باپ دونوں میں ہی بنی۔ دونوں کی ذمہ داریاں مجھ اکیلے کو ہی نبھانا تھا۔ میری زندگی میں پھر سے گہرے بادل چھا گئے۔ میں ایک مشین سی بننے لگی۔ میری بیٹی رَچنا تب صرف چودہ سال کی تھی۔

لیکن آج راکیش کا پتہ دے کر میری بیٹی نے مجھے ایک نئی راہ دِکھائی تھی۔ کتنی چھوٹی بڑی باتیں، دل کی باتیں، من کی باتیں۔ میرا بچپن، میری جوانی پھر سے لوٹ آئی۔ زندگی میں پھر سے بہار چھانے لگی۔ بھولے بسرے گیت ہونٹوں پر تھرکنے لگے۔ بے شمار نئے خیالات کا لین دین شروع ہوا۔ راکیش ایک مصنف تھا۔ مصوّر بھی تھا۔ اس نے اپنی لکھی ہوئی کتابیں مجھے بھیج دیں۔ میری زندگی کا کھویا ہوا کلاکار پھر سے انگڑائیاں لینے لگا۔ میں پھر فرصت کے پل فنونِ لطیفہ

کی مشق میں گزارنے لگی۔ خوشی ہی خوشی نظر آنے لگی۔ میرا من میور ناچنے گانے لگا۔ کبھی خط میں مَیں اُس کی ذاتی زندگی کے بارے میں پوچھتی تو وہ خاموش ہو جاتا تھا۔

اس کے لکھے خط، اس کی زبان، اس کی نظمیں، اس کی دل لبھانے والی تصویریں، اس کے خیالات ...... ان سبھی باتوں میں مَیں اپنے آپ کو بھول چکی تھی۔ میں سپنوں کی ایک دنیا میں مست ہو گئی۔

میری بیٹی رَچنا میرا ہی عکس تھی۔ اس کا رنگ، روپ، نزاکت بالکل کلا کے دیوتا کی طرح تھی۔ بیٹی سے بڑھ کر وہ میری اکلوتی سہیلی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر چین کی سانس نہیں لے سکتی تھیں۔ وہ میری نظمیں پڑھتی، میری نظموں کو وہ پسند کرنے والی بھی تھی۔ میں شروع شروع میں راکیش کے آئے ہوئے خط اسے پڑھنے کے لیے دیتی تھی۔ وہ بیحد متاثر ہوتی تھی۔ اس کا چہرہ خط پڑھ کر کھل اُٹھتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد پتہ نہیں کیوں میں نے اسے خط دکھانے بند کر دیے۔ کبھی کبھی میرا کھلا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ شرارت بھری نظروں سے پوچھتی

"کیا ممی! راکیش کا خط آیا ہے؟"

اس زندگی سے مجھے جینے کے معنی مل گئے۔ اب تک دو بچوں کی پرورش مجھ پر تھی۔ میں ٹھہری ایک جذباتی عورت! گھر اور باہر کے معاملات، کام کاج کا حساب کتاب رکھنا، یہ سب میرے پسند کے کام نہیں تھے۔ تب بھی گرہستی کی ذمہ داری مجھ اکیلی کو سنبھالنا پڑا۔

میرے پتی کی یادیں میرے ساتھ تھیں لیکن اب ہر وقت، پیار محبت، نظمیں، شعر شاعری، کہانیاں اور 'وہ' اور اس کے خیالات میرے دماغ میں چھائے رہتے تھے۔

میں بڑے جوش اور خوشی میں دن گزارنے لگی۔ میرا روپ نکھر آیا۔ میرے لباس پہننے اور بننے سنورنے میں بھی فرق آ گیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے پانچ سال یوں ہی بیت گئے۔

آخر آج 'وہ' آ رہا ہے۔ کیسا ہو گا؟ اس کی عمر؟ اس کا روپ؟ پانچ سال سے فوٹو مانگ مانگ کر تھک گئی۔ لیکن اس نے کبھی اپنا فوٹو مجھے نہیں بھیجا۔

ہماری پہلی ملاقات کیسی ہو گی؟ پہلی ملاقات کی چاہ میرے دل کو متجسس کر رہی ہے۔ کیسے ملوں؟ اپنی شخصیت کے مطابق یا بانہوں میں سمیٹ کر؟ اگر میں بے ہوش ہو گئی تو؟ ہماری پہلی

ملاقات کے وقت وہاں کوئی دوسرا شخص تو نہیں ہوگا؟ میں اکیلی ہی اس سے ملوں گی یا پھر رَچنا بھی میرے ساتھ ہوگی؟ پپو وہاں ہوگا یا نہیں؟ کام والی بائی کو اس دن اگر نہ بلاؤں تو؟ یا یسے چھٹی دیدوں؟ لیکن مالی، دھوبی، سبزی والا یہ لوگ تو روزانہ کی طرح آئیں گے ہی۔ ملنے والے لوگ گھر پر آئیں گے ہی...... لیکن جب وہ گھر میں داخل ہو تب بھگوان کرے اس پل میں اکیلی رہوں۔

لیکن ہائے! من کی مرادیں کب پوری ہوتی ہیں؟ دل کے مطابق کون سی خواہش پوری ہوتی ہے؟ وہ کہاوت ہے نا: 'Man purposes & God disposes' بالکل ٹھیک کہا ہے کسی نے۔

...... اور آج کا دن تو ایسا تھا کہ آج جب راکیش گھر میں آرہا ہے تو گھر کے سبھی لوگ حاضر تھے۔ میں نے پپو کو کسی کام کے لیے باہر بھیج دیا۔ نوکر کو سبزی لانے بازار بھیجا۔ کام والی بائی کو راشن لانے کے لیے دکان بھیج دیا تاکہ ایک گھنٹہ بھر تک وہ نہ آئے۔ لیکن رَچنا کتاب پڑھنے میں اتنی ڈوبی ہوئی تھی کہ میں نے اسے بھی پیسے دے کر کسی بہانے بینا، ٹینا، رینا یا کسی دوسری سہیلی کے یہاں بھیجنا چاہا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے تھوڑا سا میک اَپ کیا۔ پیشانی پر کانوں کے پاس کچھ سفید بال جھانک رہے تھے، کاجل کی کالی پنسل سے وہ کالے کر ڈالے۔ میں اب اپنی عمر سے دس سال چھوٹی دِکھنے لگی۔ گلابی رنگ کی ساڑی پہنی، بالوں میں گلاب کا پھول لگائے میں اپنے ہی روپ کو نہارتی رہی۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔ میرے دل کی دھڑکنیں بڑھنے لگیں۔ بچے کی طرح میں اندر دوڑ گئی۔ پردے کے پیچھے کھڑے ہو کر دیکھنے لگی۔ سارا ہال نظر آرہا تھا۔ دروازہ کھولنے کے لیے رَچنا دروازے کے پاس پہنچی۔ چوبیس پچیس سال کی عمر کا، اونچے قد والا بڑا ہی خوبصورت نوجوان اندر داخل ہوا۔

"میں راکیش ہوں" کہہ کر اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ پر یہ کیا؟...... میری آنکھیں یہ کیا دیکھ رہی تھیں...... میرے کان یہ کیا سن رہے تھے؟ رَچنا نے اپنی بانہوں میں راکیش کو سمیٹ لیا تھا اور راکیش اس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگا تھا۔

یہ منظر دیکھ کر میرے پاؤں کانپنے لگے۔ کانوں میں سیٹیوں کی آواز گونجنے لگی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، پھر نہ جانے مجھ میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ میں رسوئی گھر کے دروازے سے پیچھے کی طرف چلی گئی بے سدھ سی۔ میرے پاؤں نہ جانے کہاں پڑ رہے تھے...... میں زندگی سے بھاگ رہی تھی...... خوشیوں سے بھاگ رہی تھی۔

یہ سب کیا ہو گیا؟ کیسے ہوا؟ رَچنا کے من میں راکیش کے لیے پیار اور کشش کب پیدا ہوئی؟ وہ بھی راکیش کو خط لکھتی تھی؟ کیا اسے راکیش کی عمر کا پتہ تھا؟ اکیلے راکیش کو کیوں الزام دوں؟ ہم نے خطوں میں ایک دوسرے سے کبھی پیار نہیں جتایا۔ ماں اور بیٹی ایک ہی شخص سے اَنجانے میں پیار کر بیٹھیں اور تقدیر کی یہ کیسی چال ہے کہ دونوں اس سے بے خبر تھیں۔ محبت کا یہ کیسا تکون تھا- ماں بیٹی کے بیچ میں یہ کیسا امتحان کا وقت آن پڑا تھا؟

میں نے خود کو سنبھالا۔ انتہائی متانت سے باغیچے کی طرف مڑی۔ وہاں پانی سے منہ دھویا۔ چہرے کا میک اَپ نکل گیا۔ بالوں میں جو کالی پنسل کی لکیریں کھینچی تھیں اُنھیں بھی مٹا ڈالا۔ پیشانی پر پلّو اوڑھا ایک ہی لمحہ میں اپنے کو عمر سے زیادہ بڑی سمجھنے لگی۔ ایک لڑکی کی ماں کے روپ میں خود کو ڈھال لیا۔

رسوئی گھر کے پچھلے دروازے سے میں اندر آئی۔ فرج سے پانی کی بوتل نکالی، ٹھنڈا پانی پیا۔ آواز سن کر رَچنا اندر آئی اور بڑے ہی پیار سے میرے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

"ممی، کہاں گئی تھیں تم؟ دیکھو تو، تمہارا راکیش آیا ہے"۔

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا اور من پر پوری طرح سے قابو پا کر بولی: "کہو بیٹا، راکیش! سفر کیسا رہا؟"



گھر

"منحوس! تم نے میری زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔ نکل جاؤ میرے گھر سے!" ونود نے زور سے چلاتے ہوئے وندنا کو دھکے دینا شروع کیا۔ دھکے دے کر اسے باہر نکالا اور دروازہ بند کر دیا۔ وندنا دروازے کے باہر بیٹھی رہی۔ اس کے ہوش اُڑ گئے۔ کانپتا ہوا جسم، زبان خاموش، پیلا چہرہ، آنسوؤں سے بھرا ہوا...... دھندلی آنکھوں سے اس نے دروازے کی نیم پلیٹ کو دیکھا۔ اس کے نام والی پلیٹ "شریمتی وندنا!"

اس کے دونوں بچے کالج میں پڑھ رہے ہیں۔ ابھی کالج کی گروپ کے ساتھ دونوں باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ اپنے گھر کے باہر بیٹھی رہی۔ اُس کی کانوں میں ونود کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے "نکل جاؤ میرے گھر سے" غصے اور ذلت سے اس کا جسم کانپنے لگا۔ 'میرا گھر' یعنی یہ مسٹر ونود کا گھر ہے، میرے پتی کا گھر ہے۔ یہ کسی مرد کا گھر ہے۔ تو پھر عورت کا گھر کون سا ہوتا ہے؟

وہ اپنے گھر کی چوکھٹ کے باہر بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد گھر کا دروازہ کھلا اور کھلا ہی رہ گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ ونود اُسے گھر سے باہر نکالنا نہیں چاہتا ہے۔ شاید کتنے سالوں کا دبا ہوا غصہ زندگی میں پہلی بار اُس نے نکالا تھا۔ وہ بھی بہت ہی چھوٹی سی بات پر کہ سبزی میں نمک زیادہ پڑ گیا۔ وہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا تھا۔ مرد کتنے چھوٹے دل والے ہوتے ہیں۔ انھیں اپنی چھوٹی چھوٹی قربانیاں بھی بہت بڑی لگتی ہیں اور وہ کبھی نہ کبھی اس کا غصہ عورت پر ضرور نکالتے ہیں۔ عورت کو تو قربانیوں کی پتلی مان کر اس کا سب کچھ چھین لیا جاتا ہے۔ پھر اسے مہمان کہہ کر ہر حق سے بے دخل کر دیا جاتا ہے۔

جلد ہی وِنود نے اپنی غلطی کو جان لیا، اس لیے دروازہ کھلا ہی رکھا۔ اب پچھتاوے کے سبب وہ اس سے منہ چھپا رہا تھا۔ وِنود نے ساری زندگی اس کا ساتھ دیا تھا لیکن اس کا ایسا برتاؤ وندنا پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ اسے پورا بھروسہ تھا کہ وِنود کی یہ پہلی اور آخری بھول ہے۔

وہ گھر کے اندر داخل ہوئی۔ سکون بھرے انداز سے مٹکے سے پانی کا گلاس بھرا اور دھیرے دھیرے، ایک ایک گھونٹ کرکے وہ پانی پینے لگی۔ پھر کمرے میں جاکر دروازہ بند کرکے پلنگ پر لیٹ گئی اور چپ چاپ سسکیوں کے بیچ خاموش آنسو بہانے لگی۔ وہ سوچنے لگی، ونود نے 'میرا گھر' الفاظ پر اتنا زور کیوں دیا؟ یہ گھر بتی کا ہے؟ مائکے والا گھر بھی میرا نہیں تھا۔ سسرال والا گھر بھی میری ساس کا تھا۔ پھر میرا گھر؟ عورت کا کون سا گھر اس کا اپنا گھر ہوتا ہے؟ اس کے اس کے اندر سے آتما کی آواز آئی "یہ تمہارا اپنا گھر ہے اور بس" اس کے دل کو چین آ گیا۔

اُسے گزری باتیں یاد آنے لگیں۔ یاد آنے لگا، اپنے بابل کا گھر اور ساتھ ہی بہت سی بھولی بسری باتیں......

بچپن سے ہی اسے اپنے بھائیوں، بھابیوں، بھتیجوں اور ماں سے بہت پیار تھا۔ بابوجی تو بہت پہلے گزر چکے تھے۔ میٹرک کے بعد اس نے پڑھائی کے ساتھ نوکری کرنی شروع کردی۔ مہینے کی پہلی تاریخ کے دن ماں کی ہتھیلی پر پیسے رکھ کر وہ کہتی تھی "ماں! ہوں نہ میں تمہارا گلاب بیٹا؟"

ماں بھی اس کی پیشانی چوم کر کہتی تھی "ہاں میرے گلاب بیٹے!"

وندنا کا چہرہ چمک اُٹھتا تھا۔ اس کے کام کرنے کی طاقت اور جوش دُگنا ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے گھر کے لیے چائے کی خوبصورت پیالیاں، کراکری، صوفہ سیٹ، الماری، ویڈیو نیز خوبصورت کپڑے خرید کر لاتی اور بھائی بھابیوں کو کہتی تھی "وندنا کے راج میں سبھی خوش رہو"۔

مزید چیزیں خریدنے کے لیے وہ ٹیوشن بھی کرنے لگی۔ ایسے بہت سے کام کرتی جس سے کچھ پیسے جوڑ کر اپنے خاندان کے لوگوں کو خوش رکھ سکے۔ محنت کے لیے اس کے مانو آٹھ ہاتھ تھے اور چوبیس گھنٹوں سے بھی زیادہ وقت۔ اُس کے بھائی کمائی تو بہت کرتے تھے لیکن گھر میں کھانے والے زیادہ تھے اس لیے پیسہ پورا نہیں پڑتا تھا۔

ماں اس کی پیشانی کو چوم کر کہتی تھی "ہاں! تم ایک دم میرا گلاب بیٹا ہی ہو۔ میرا تیسرا چھوٹا بیٹا جب گزر گیا تو "چالیہو" کا اُپواس رکھ کر دن رات دعائیں لیتی رہی۔ "دریا شاہ دادلے" جھولے لال نے تمہیں تب میری جھولی میں ڈال دیا"۔

وندنا کو اپنا بچپن اچھی طرح یاد تھا۔ اس کے پیدا ہوتے ہی ماں نے اس کے بھائی گلاب کے رکھے ہوئے لڑکوں والے کپڑے پہنانے شروع کر دیے تھے۔ پہلی بار اُس نے لڑکیوں والا فراک اس کے اسکول کا یونیفارم پہنا تھا۔ لڑکوں کے کپڑے پہن کر وہ اپنے دونوں بھائیوں اور اُن کے دوستوں کے ساتھ لڑکوں کے کھیل گلّی ڈنڈا، گوٹیاں، چھپا چھپی کھیلتی تھی۔ اسے بچپن میں کھانا بھی مردوں کے برابر ملتا تھا- دو سبزیاں، دہی، چاول، روٹی، پاپڑ اور اَچار۔ گھر کی باقی ساری عورتوں اور لڑکیوں کو ایک سبزی، روٹی اور چاول ملتے تھے۔ ماں کو پورا بھروسہ تھا کہ وندنا اس کا تیسرا بیٹا گلاب ہے۔ اس طرح میں بیٹے جیسی زندگی جیتی رہی۔

ایک رات بخار میں تپتے ہوئے نہ جانے کیوں ماں نے وندنا کو گلے لگا کر کہا "وندنا، میرا اکلو بیٹا تم پرائی اَمانت ہو۔ اپنا گھر بسالو۔ تم میرا سمجھدار خوبصورت بیٹا ہو......" اتنا کہتے کہتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ ماں کی باتیں اسے دہلا گئی تھیں۔ پچیس سال سے اپنا خون سکھا کر تن من دھن سے دن رات اس نے اس گھر کے لیے ہی سوچا تھا۔ ماں کے اس ایک جملے سے اس کے پیروں تلے کی زمیں کھسک گئی۔ اس نے اُٹھ کر گھر کی دیواروں اور چھتوں کو چھونے کی کوشش کی۔ یہ میری اپنی ہے بیگانی کس طرح ہوئی؟ یہ گھر میرا نہیں تو کس کا ہے؟ آخر وہ تھک کر ماں کے گلے سے لگ کر سوئی۔

ونود تین چار سال تک اس کی 'ہاں' کا انتظار کرتا رہا۔ وہ اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ کالج کی کسی میٹنگ میں وہ ملے تھے اور ملاقاتوں کے دوران محبت کے ڈور میں بندھ گئے۔ وہ اسے شادی کے لیے راضی کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وندنا اسے ہر بار یہی کہتی رہی کہ وہ شادی نہیں کرے گی کیونکہ اس کے اوپر اپنے گھر کی ذمہ داریاں ہیں۔ وہ اپنے گھر کا بیٹا ہے، بیٹی نہیں۔

آج ماں نے یہ کیا کہہ دیا کہ اپنا گھر بسالے۔ جیسے گوتم بدھ کی زندگی میں ایک رات آئی تھی قربانی اور ونواس کی۔ اسی طرح وندنا کی زندگی میں بھی ایک رات آئی تھی اور اس رات اس

نے ایک فیصلہ لیا۔

تین چار مہینوں میں ہی اس رات کے فیصلے کو اس نے سچ میں بدل دیا۔ اس نے وِنود کو شادی کے لیے ہاں کہہ دیا اور اپنے کچھ دوستوں کی مدد سے کورٹ میں شادی کرلی۔ شادی کرنے کے بعد وہ اپنے پتی کے ساتھ اپنے مائکے والوں سے خاص طور پر اپنی ماں سے ملنے آئی۔ خاندان کے لوگ پہلے تو چونک پڑے۔ انھیں یقین نہیں آرہا تھا، پھر ناراض ہوگئے۔ دھیرے دھیرے سب شانت ہوگئے۔ گھنٹے دو گھنٹے میں سب ٹھیک ہوگیا۔ وداعی کے وقت اپنی ماں سے لپٹ کر کہنے لگی "ماں تم ہی میری گرو ہو، جس نے مجھے اس حقیقت سے واقف کرایا کہ میں نے ایک بیٹے کی روح لے کر بیٹی کا جنم لیا ہے۔ یہ حقیقت میں اپنے دل سے تسلیم کرتی ہوں اور اپنے اصلی گھر میں جارہی ہوں"۔

خاندان کے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ماں سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ ونود نے ماں سے عہد کیا کہ وہ ان کی بیٹی کو سر آنکھوں پر رکھے گا اور اسے کوئی بھی شکایت کا موقعہ نہیں دے گا۔ جلد ہی دونوں نے الوداع کہا۔ وَندنا دل کی دھک دھک کے ساتھ انجانے گھر کی طرف نکل پڑی۔

کچھ ہی منٹوں بعد وہ دونوں ایک بہت بڑی شاندار حویلی کے دروازے پر پہنچے جس میں وَندنا کے ساس سسر رہتے تھے۔ وِنود اپنے ماں باپ کا لاڈلا اور اکلوتا بیٹا تھا۔ اس نے زندگی میں جو بھی چاہا حاصل کیا تھا۔ اس نے وَندنا کو یہ یقین دلایا تھا کہ پہلے اس کے ماں باپ ضرور چونکیں گے۔ کچھ ناراض بھی ہوں گے۔ لیکن اپنی اکیلی اولاد کے لیے وہ سب کچھ مان لیں گے۔

وَندنا نے جوش و جذبہ، اُمنگ اور نئی نئی آرزو ساتھ لیے وِنود کے گھر کی دہلیز پر پاؤں رکھا۔ نئی نویلی دلہن کی اُمنگ اس کے من میں اُبھرنے لگی۔ دل کا دھڑکنا، حیا، چاہت، اپناپن، محبت اور عقیدت ...... اس گھر کے لیے لے کر اپنے پتی کے ساتھ وہ اپنے بابل کو چھوڑ کر آئی تھی۔ تھوڑی سی گھبراہٹ اس کے دل میں تھی۔

وِنود نے دروازے پر دستک دی۔ ایک نوکرانی نے دروازہ کھولا۔ وَندنا نے محسوس کیا کہ اس کے پتی کا چہرہ پیلا پڑ رہا تھا۔ وہ کچھ کانپ بھی رہا تھا۔ وہ اندر کے کمرے میں آئے جہاں پر

کے ساس سسر بیٹھے تھے۔ وِنود نے کہا "بابا، یہ تمہاری بہو ہے۔ میں نے آپ کو اس کے بارے میں تھوڑا بہت بتایا تھا"۔

وَندنا سسر کے پاؤں چھونے آگے بڑھ ہی رہی تھی کہ ساس نے اِشارے سے منع کر دیا۔ وہ کھڑی رہ گئی۔ وِنود نے اسے صوفے پر بٹھایا اور کہا "تم بیٹھو، میں پانی پی کر ابھی آیا"۔

وِنود کمرے سے باہر نکلا تو ساس سسر نے اس پر لفظوں کے تیر برسانے شروع کر دیے۔ ایک کے بعد ایک تہمت...... وہ اسے الزام دینے لگے۔ اس کے مائکے والوں کو بھلا برا کہنے لگے۔ وہ اکیلی چپ چاپ گردن جھکائے ساس سسر کی ڈانٹ پھٹکار سہنے لگی۔

ساس نے ڈانٹتے ہوئے کہا "نکل جا میرے گھر سے! یہ گھر میرے نام پر ہے۔ تم وِنود سے شادی کر کے میری یہ حویلی ہتھیانا چاہتی ہو۔ یہاں آنے کی تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟ یہ میرا گھر ہے صرف میرا"۔

وہ مانو برف بن گئی۔ بار بار دروازہ کی طرف تاکنے لگی کہ وِنود آئے اور اپنے رشتہ داروں کو سمجھائے۔ وہ چپ چاپ گردن جھکا کر تیکھے زہریلے تیروں کو برداشت کرتی رہی۔ دروازہ پر آہٹ ہوئی۔ اس نے دیکھا وہ وِنود نہیں تھا بلکہ دو چار مرد تھے جو اُندر آئے اور وَندنا کو خوفناک نظروں سے گھورنے لگے۔ ایک دہاڑ کمرے میں گونجی۔ تبھی وِنود بھی کمرہ میں آگیا تھا۔ اسے مانو سہارا مل گیا۔ بہت ہی نرم آواز میں اس نے وِنود سے کہا "دیکھو یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ یہ تمہارا گھر نہیں ہے"۔

"باہر نکلو!" دہاڑ سن کر وِنود پیپل کے پیڑ کے پتوں کی طرح تھر تھر کانپنے لگا۔ وَندنا پڑھی لکھی اپنے پاؤں پر کھڑی ایک خوددار مہذب اور جذباتی عورت تھی۔ دہاڑ سن کر اس کی ایسی حالت تھی کہ زمین اب پھٹ پڑے اور سیتا ماتا کی طرح اسے اپنے آپ میں سما لے۔ وِنود اور سبھی لوگ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ وہ اسی کمرے میں اکیلی بیٹھی رہ گئی۔ دوسرے کمرے سے زور زور سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ وہ سبھی لوگ آپس میں مل گئے تھے اور وِنود اکیلا۔ بیچ بیچ میں کوئی 'پولیس...... پولیس' بھی چلا رہا تھا۔

آخر آدھے گھنٹے کے بعد تھوڑے سے نوٹ ہاتھ میں لیے وِنود باہر نکلا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "اُٹھو، چلو وَندنا! اس وقت میرے ساتھ باہر چلو۔ جب تک سب شانت نہ ہو جائیں"۔ وہ

دونوں اس گھر سے بے عزت ہو کر باہر گئے۔ گھر کی دہلیز کو پار کرتے وقت وَندنا نے محسوس کیا کہ یہ گھر کسی قیمت میں اس کا نہیں ہے۔ میرا گھر؟ اور اس نے دل ہی دل میں ایک عزم مصمّم کر لیا کہ پھر اس گھر میں وہ کبھی پاؤں نہیں رکھے گی۔ "وندنا! چلو میں تمھیں تمہارے مائکے میں چھوڑ آتا ہوں۔ دھیرے دھیرے اپنے گھر والوں کو میں سمجھالوں گا"۔

"نا......" وَندنا نے پکے اِرادے سے کہا...... "میں اپنے مائکے میں اب قدم نہیں رکھوں گی اور نہ ہی کبھی اِس گھر میں رہوں گی" اس حویلی کو اس نے وداعی نظروں سے دیکھا۔

وِنود نے اسے اپنے اسکوٹر پر بٹھالیا، وہ خاموش اور خالی خالی نظروں سے راستوں کو دیکھتی رہی۔ سکوٹر ایک ہوٹل کے دروازے پر آکر رکی تو وَندنا چونک پڑی۔ اس نے اُلجھن بھری نظروں سے پتی کی طرف دیکھا۔ وِنود کی شرم کے مارے گردن جھک گئی۔ اس نے اپنی گردن گھمالی۔ ہوٹل والے سے کچھ بات چیت کر کے وِنود باہر نکل آیا اور دونوں ایک سیڑھی چڑھ کر ایک کمرے کے باہر آکر کھڑے رہے۔ ایک لڑکے نے تالا کھولا، بتی جلائی۔ وَندنا نے کمرے میں رکھے ہوئے پلنگوں کی طرف دیکھا، رُلائی اس کے حلق میں اٹک گئی۔ اُس لڑکے نے صاف ستھری چادریں بدل دیں۔ اس رات دونوں الگ الگ پلنگوں پر سوئے لیکن دونوں ہی جاگ رہے تھے۔

دوسرے ہی دن سے وِنود نے نوکری پر جانا شروع کر دیا۔ ہوٹل والے نے وہ کرہ اُن لوگوں کو ایک مہینے کے کرائے پر دیا تھا۔ اُس ہوٹل والے کی بیوی نے ایک عورت کے جذبات کو سمجھا اور کمرے میں ہی کھانا پکانے کی اجازت دے دی۔ اُسی عورت نے ہوٹل کے کمرے کو گھر بنانے میں اس کا ساتھ دیا۔ برتن، چائے کے پیالے، پتیلیاں، تھالیاں، کٹورے، چمچے، چادر، تولیہ وغیرہ خرید کر وہ اپنا چھوٹا سا گھر سجانے میں مشغول ہو گئی۔ اس ہوٹل میں رہنے کی بات اس نے اپنے مائکے والوں، سہیلیوں، اپنی نوکری کی جگہ کسی کو نہیں بتائی تھی۔ اپنے مائکے میں بھی وہ نہیں گئی تھی۔ اُنھیں کیا سنائے؟ اپنے پتی اور ساس سسر کی برائی کس منہ سے کرے؟ اس کے گھر کے لوگ سنیں گے تو دُکھ کے مارے ان کے سینے پھٹ جائیں گے۔ وِنود اپنے رشتہ داروں سے ملتا تھا۔ اُن لوگوں نے کہا تھا پیسوں کی کوئی مدد نہیں کریں گے...... تم اُسے چھوڑ دو...... وِنود وَندنا کے کندھوں پر سر رکھ کر کہتا تھا "مجھے اپنی جائیداد سے بھی بے دخل کر دیا گیا ہے"۔

وَندنا اُسے دلاسہ دیتے ہوئے کہتی تھی "میں نوکری کر تو رہی ہوں۔ تم کوئی خیال دل میں مت لاؤ"۔

جس عمر میں پہننا، اوڑھنا، آرائش کرنا تھا اس عمر میں وَندنا کنجوس بن گئی۔ وِنود نوکری کی تلاش کرتا رہا اور وَندنا پیسے جوڑنے میں مصروف ہو گئی۔ اسے لگتا تھا ڈپازٹ دے کر کوئی چھوٹا سا گھر کرائے پر لے کر ڈھنگ سے رہیں گے۔ کب تک سہیلیوں سے یا مانگے والوں سے نہیں ملے گی؟ کب تک سب کچھ چھپاتی پھرے گی؟ اس کے دماغ میں ایک ہی جنون تھا کہ پہلے کرائے پر گھر لینگے، اس کے بعد اپنا گھر۔ جب تک اپنا خریدا ہوا گھر نہ ہوگا وہ بچوں کو اس دنیا میں نہیں لائے گی۔ وِنود بھی وَندنا کے اس عہد میں شامل ہو گیا۔ پہلے انھوں نے کرائے کا گھر لیا پھر کچھ سالوں کی محنت سے دونوں ایک فلیٹ خریدنے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ وَندنا کے دل نے اسے بتا دیا کہ صرف یہی اس کا اپنا گھر ہے۔ پھر پہلے سال چھوٹی سی گڑیا اُن کی زندگی میں آئی۔ دو سال کے بعد بیٹا...... وَندنا نے دونوں کی پرورش پر پورا دھیان دیا۔ دھیرے دھیرے کروڑپتی سسرال والے وِنود کو دکان پر بیٹھنے کی اجازت دینے لگے۔ پھر تھوڑے پیسے بھی دینے لگے۔ لیکن دونوں کو الگ کرنے کی سازش میں وہ لوگ اب بھی لگے ہوئے تھے۔ اوپر والا یہ کھیل چپ چاپ دیکھتا رہا۔

وقت بیتتا گیا۔ بچے بڑے ہو گئے۔ لڑکی کی شادی اچھے گھر میں ہو گئی۔ وہ اپنے پتی اور بچوں کے ساتھ خوش تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ وِنود جس کے بل بوتے اور پیار کے سہارے اس نے اپنی زندگی کا اتنا بڑا سفر طے کیا تھا وہ ایک حادثہ میں اس دنیا سے چل بسا۔ اس حادثے نے وَندنا کو توڑ ڈالا۔ اُس صدمے سے باہر نکلنے میں اسے بہت وقت لگا۔

بیٹے کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ دھیرے دھیرے گھر بچوں کی توتلی آوازوں سے بھرنے لگا۔ وہ اپنے پوتے پوتیوں کو پریوں کی کہانی سناتی، لوری گاتی، ڈھیر سارا پیار کرتی اور اپنے آپ کو پوری طرح سیراب پاتی۔

بہو بڑے گھر سے آئی ہوئی تھی۔ آجکل وہ بات بات پر چڑ جاتی تھی۔ چھوٹے سے فلیٹ میں اسے گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ اسے بڑے بنگلے میں رہنے کی عادت جو تھی۔

وندنا نے دھیرے دھیرے جان سے زیادہ عزیز اپنی کتابوں کو پہلے چھجے پر رکھا پھر ستار، ہارمونیم وغیرہ ساری چیزیں کوٹھی میں رکھ دیں۔ کپڑوں کی اَلماری خالی کر کے وہاں بچوں کے کھلونے اور کپڑے رکھ دیے۔ وہ اپنے آپ کو جتنا ہو سکتا تھا سمیٹتی چلی گئی۔ بیٹی کے مائکے میں آنے پر گھر میں اور بھی کٹ کٹ بڑھ جاتی تھی۔

وندنا تو ہر حال میں خوش تھی۔ اس شور شرابے کے گھر میں وہ بہت مطمئن تھی کیونکہ وہ اس کا اپنا گھر تھا۔ آج اس کا بیٹا آفس سے جلدی گھر لوٹا اور ماں سے سماچار لینے لگا۔ اپنے دل کی باتیں کہنے لگا۔ آفس کا کام کاج، تنخواہ میں اضافہ ...... پھر ماں کو پیار اور دلار سے اپنی باہوں میں باندھ کر کہا......

"ماں ایک خوشخبری سنو۔ میری ترقی ہو گئی ہے۔ ایک اچھا سا بنگلہ بک رہا ہے جسے خریدنے کے لیے کچھ پیسے کمپنی دے گی اور آدھا سسر جی۔ یہ فلیٹ بیچ کر بنگلے کے لیے فرنیچر بنا لیں گے۔ تو ماں، کل میں ایجنٹ کو کہہ رہا ہوں کہ فلیٹ بکوا دے۔ پھر ماں تم رانی کی طرح بڑے بنگلے میں چل کر راج کرنا"۔

"بیٹا ٹھہرو! سنو! یہ کوئی فلیٹ نہیں ہے۔ یہ گھر ہے۔ تمہاری ماں اور بابوجی کا ایک آشیانہ جو تنکا تنکا کر کے ہم نے جوڑا ہے۔ اس گھر میں تمہارے پتاجی کی یادیں بسی ہوئی ہیں۔ یہ گھر میرا دل ہے اور میں اس کی دھڑکن ہوں۔ تم شاید اِن جذبات کو نہیں سمجھ پاؤ گے۔ تمہاری ترقی ہوئی ہے اور اب تم لوگ بڑے بنگلے میں رہنا چاہتے ہو۔ لیکن بیٹا میں ہر حال میں یہاں پر خوش ہوں۔ یہ فلیٹ ایک مندر ہے۔ میں یہیں رہوں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ کہہ کر وہ چپ چاپ پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔ اس کا دل مطمئن تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ستار بجاتے، ہارمونیم کے تار چھیڑتے، اشعار لکھتے اور پینٹنگ میں مصروف ہوتے دیکھا...... پوری طرح سیراب تھی وہ۔

صبح سویرے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ روزمرہ معمولات کے مطابق اس نے یوگا کی کا دھیان کیا۔ پھر تمام معمولات سے فارغ ہو کر وہ پوجا کرنے مندر کی طرف بڑھی کہ تبھی بیٹا اس کے پاس آ بیٹھا۔

"ماں، کچھ کہنا ہے تم سے!"

"کہو بیٹا!" اس نے پیار سے کہا اور اگربتی جلائی۔

"ماں، رات کو تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ تم نے سچ کہا تھا کہ یہ صرف فلیٹ نہیں بلکہ ایک گھر ہے، ایک مندر ہے۔ اب ایسا کیا کریں کہ یہ گھر بھی رہے، وہ بنگلہ بھی رہے اور ساتھ ساتھ رہنے کا احساس بھی رہے۔ ایسا کوئی راستہ......؟"

"ہاں بیٹا! بیچ کا راستہ بھی ضرور نکلے گا۔ پوجا تو پوری کرلوں"۔ اس نے آرتی کا دیا جلایا۔ بھگوان پر پھول اور چندن چڑھایا۔ کافور کی ہلکی خوشبو فضا میں پھیل گئی۔ ایک بھینی پاکیزہ خوشبو سے سارا گھر بھر گیا۔ ماں نے آرتی پوری کی۔ پھر پانی کے چھینٹے ہر ایک کمرے میں ڈالنے لگی۔ بہو، پوتے، بیٹا سبھی نے آرتی لی۔

ماں نے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "سنو بیٹا! ہم سب ایک دوسرے کو بہت پیار کرتے ہیں۔ بہو بھی غلط نہیں ہے۔ بڑے گھر میں رہنے کی اسے عادت ہے۔ آگے چل کر بچے بھی بڑے ہوں گے۔ تم لوگوں کو بڑے گھر کی ضرورت پڑے گی۔ اب تم کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ماں! فرنیچر تو بنتا رہے گا۔ گھر نہیں بیچیں گے"۔

"بیٹا، جب مجھے تم لوگوں کی یاد ستائے گی تو آجایا کروں گی تمہارے گھر میں...... کبھی تم اس گھر میں آتے رہنا"۔

تھوڑے ہی دنوں میں بیٹا نئے گھر میں رہنے چلا گیا۔

تنہائی میں وندنا اپنے آپ سے گفتگو کرتی۔ گھر نام سے کچھ تلخ تجربے پاکر اس نے کچھ لکیروں میں اپنے آپ کو بچپن سے ہی قید کر رکھا ہے۔ مائکے والا گھر! سسرال والا گھر! یہ گھر۔ وہ گھر! اس قید سے نکل کر اسے احساس ہوا کہ حقیقت میں 'گھر' ایک بہت بڑا لفظ ہے۔ ایک احساس ہے یہ۔ اپنے پن سے بھرا ہوا جس کو الفاظ کا کوئی جامہ نہیں پہنا سکتے۔ جسم بھی تو ایک گھر ہی ہے جسے چھوڑ کر اپنے اصلی گھر میں جانا ہے اور وہ ہے آتما کا پرماتما میں سمونا۔ اس کا "نج دھام" جسے وہ بچپن سے کھوجتی رہتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو "ساکشی بھاؤ" میں دیکھنے لگی۔ بچپن سے بڑھاپے تک کے سوالوں کے جواب اسے اپنے دل سے ملنے لگے۔ اس نے اپنے آپ کو لامحدودیت اور وسعت کے احساس سے بھرا ہوا پایا۔ اس کا ضمیر روحانی انوار سے روشن ہو گیا۔ سکھ اور طمانیت کا نور اب اس کے چہرے پر چھانے لگا تھا۔



تتر بتر

"ہیلو...... ہیلو"

میں فون کرتی رہی۔ فون پر کسی نے انگریزی میں بات کی۔

'ہیلو' کے جواب کے بعد میں نے سندھی میں کہا "آپ سندھی ہیں؟"

جواب پھر انگریزی میں آیا "لیس!"

میں نے کہا "گھر میں کوئی سندھی بولنے والا ہے؟"

اس نے کہا "ہاں! میری ساس ہے جو ستر سال کی ہیں۔"

وہ سب کچھ انگریزی میں کہہ رہی تھی۔ "آج کل کس کو سندھی آتی ہے؟ ٹھہریے، میں اپنی ساس کو بلاتی ہوں۔ پر آپ کون ہیں؟ آپ کا نام کیا ہے؟"

میں نے اپنا نام بتادیا۔ اس نے پوچھا "کیا آپ بھی سندھی ہیں؟"

میں نے کہا "ہاں!"

"میری ساس کی عمر کی ہیں؟"

میں نے 'نا' کہا اور اپنی عمر بتادی۔

"ارے! پھر آپ کو سندھی کیسے آتی ہے؟" اس کے دل میں تجسس پیدا ہوا۔

میں ہنس پڑی اور بولی "اپنی ساسو جی کو بلاؤ"۔

اس نے کسی کو آواز دی۔ سندھی ہوتے ہوئے بھی اسے سندھی بولنی نہیں آتی تھی۔ اپنا نام اس نے 'نیتو' بتایا تھا۔ اس کی ساس کے آنے تک ہماری گفتگو انگریزی میں ہی چل رہی تھی۔ اس

نے پوچھا "آپ سندھی اسی لیے بول سکتی ہیں کیونکہ آپ سندھی ذریعہ تعلیم سے پڑھی ہوئی ہیں"۔

نیتو میری بات سن کر پھولی نہیں سمائی اور نخرے بھرے آواز میں بولی "میں فلاں فلاں کانوینٹ سے پڑھی ہوں اسی لیے میرا تلفظ بھی امریکن جیسا ہے"۔ میں نے اس کے بات کرنے کے ڈھنگ اور اس کی بھاشا کی خوب تعریف کی۔ وہ بہت خوش ہوئی، مانو اس نے آسمان چھو لیا تھا۔ اس کی بوڑھی ساس فون کے قریب آئی۔ وہ نیتو سے ہندی میں بات چیت کرنے لگی۔

نیتو مجھے فون پر کہنے لگی "کیا کروں؟ میری ساس کو انگریزی نہیں آتی۔ نوکرانی کے لیے تھوڑی تھوڑی مراٹھی سیکھ لی ہے اور ساس کے لیے ہندی"۔

نیتو نے ساس کو فون دیتے ہوئے کہا "ممی، کوئی سندھی مائی (عورت) ہے جو تم سے سندھی میں بات چیت کرنا چاہتی ہے۔ میں تو انھیں جانتی نہیں"۔

فون پر میں نے پیار سے پوچھا "اماں کیسی ہو؟"

نہ جانے میں نے کیا کہہ دیا تھا کہ فون پر مجھے زور زور سے سسکیوں کی آوازیں سنائی دیں اور ایک دھیمی کانپتی ہوئی آواز آئی "تم نے مجھے اماں کہا، تم نے سندھی میں بات چیت کی"۔

میرا بھی دل بھر آیا۔ اَنجانی، اَن دیکھی وہ عورت میری ماں کی عمر کی تھی۔

آخر ہم دونوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس نے پوچھا "تم کون ہو؟ سندھی میں کیوں بولنا چاہتی ہو؟ تمہاری عمر کتنی ہے؟ نام کیا ہے؟"

میں نے بوڑھی اُماں کو سب کچھ بتایا۔ سندھی میں بات چیت کرنے کا اپنا مقصد ٹالتے ہوئے میں نے کہا "اماں، نزدیک ہی تو رہتے ہیں۔ گھر میں نہیں بلاؤ گی؟"

"کیوں نہیں میرے دل! نیتو گھر کا پتہ بتا دے گی تمھیں! مجھے تو راستوں کا کچھ پتہ نہیں۔ موتیابند کے آپریشن کی وجہ سے معذور سی بن گئی ہوں۔ ہاں، ہمارا فون نمبر کہاں سے ملا تمھیں؟"

میں نے کہا "ماڈل کالونی کے سارے سندھیوں کے فون نمبر میں نے ڈائرکٹری سے ڈھونڈ لیے ہیں"۔

"کیوں، کیا کرو گی؟ سبھی سندھیوں کو مل کر کیا چندہ اکٹھا کرنا ہے؟ یا سندھی سنستھا کا ممبر بنانا ہے۔ اس علاقے میں جہاں سب مراٹھے ہی رہتے ہیں، کیا سندھی بھی رہتے ہیں؟ تمھیں معلوم

ہے کہ کتنے سندھی رہتے ہیں؟ میں تو کسی کو نہیں جانتی۔"

میں نے ہنس کر کہا "تگ بھگ اڑتیس یا چالیس گھر ہیں سندھیوں کے۔ لیکن سب بکھرے ہوئے۔ ایک دوسرے سے بے خبر۔ ایک تو مراٹھی ٹائپ سندھی یا دوسرے ہندی یا انگریزی جیسے۔ سندھی نہیں جیسے مختلف زبانوں کے لوگ لگتے ہیں وہ سب۔ اپنے آپ کو کسی بھی رنگ میں رنگنے والے سندھی اس قدر رنگ گئے ہیں کہ ان کے اصلی رنگ کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ اپنی ہی تہذیب، پہناوا سب بھول گئے"۔

دوسری طرف سے کوئی آواز نہ آنے پر میں سمجھ گئی کہ بوڑھی ماں کو میری باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ میں نے جلدی سے کہا "اماں، بہو کو بولو کی مجھے اپنے گھر کا پتہ بتادے۔ گھر آکر میں آپ سے ڈھیر ساری باتیں کروں گی"۔

دوسرے دن ٹھیک وقت پر میں نے ان کے گھر میں قدم رکھا۔ بہت بڑا شاندار باغیچہ تھا۔ ڈھیر سارے پھول کھلے ہوئے تھے۔ میں اُن پھولوں کے بیچ پھول جیسا کھلتا ہوا ایک مکھڑا دیکھا۔ اس نے مسکرا کر ہاتھ بڑھا کر انگریزی میں کہا "میں نیتو ہوں!" میں نے بھی اپنا نام بتایا۔ وہ حیران ہو کر کہنے لگی "فون پر باتیں کرتے وقت ایسا لگ رہا تھا کہ کھدر کی ساڑھی پہنے ہوئے، جوڑا بنائے، ماتھے پر ٹیکا لگائے ہوئے، کوئی گاندھی کے زمانے کی سماج سیویکا ہو گی۔ پر آپ تو میرے جیسی دِکھائی دے رہی ہیں، ایک دم ماڈرن!"

میں نے تھوڑا سا شرما کر اس کی باتوں کو کاٹتے ہوئے کہا "اندر چلنے کے لیے نہیں کہو گی؟ کہ یہیں سے لوٹ جاؤں؟" وہ زور سے ہنس پڑی اور استقبال کیا۔ بنگلے کا آنگن ختم ہوتے ہوتے میں نے پرس سے 'جھولے لال' کا ایک فوٹو نکالا اور اسے دیتے ہوئے کہا 'تمہارے لیے یہ تحفہ" وہ کچھ ہکی بکی سی ہو گئی اور 'تھینکس' بولی۔

چلتے چلتے اس نے بہت معصومیت سے پوچھا "دیدی، میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔ برا تو نہیں لگے گا؟" میں نے کہا "بالکل نہیں!"

"دیدی، یہ کس کی تصویر ہے؟"

میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں بھولا پن تھا۔

میرے منہ میں کڑواہٹ بھر گئی۔ سندھی اور سندھی تہذیب کے نام پر...... اِن جذبات کو دبا کر میں نے نقلی مسکان چہرے پر لا کر کہا 'نیتو، یہ لال سائی جھولے لال جل دیوتا ہیں! سندھیوں کے کل دیوتا" اس نے بجھی سی آواز میں کہا "مجھے اب تک معلوم کیوں نہیں پڑا؟"

میں نیتو کے اس سوال کا جواب کن الفاظ سے دوں؟ کیا وجہ بتاؤں؟ کس کو الزام دوں؟ میں سوال کا جواب ڈھونڈتے آگے بڑھی۔ اس اَن دیکھی اَماں کی تلاش میں۔

ہم دونوں گلے ملے۔ اَماں نے پیار سے کہا "آ میری سندھیانی!"

میں زور سے ہنس پڑی۔ بہت دیر تک ان کی صحبت میں رہی۔ میرا دل بھر آیا۔ مجھے اپنی ماں کی یاد آئی۔ میری ماں تین چار سال ہوئے انتقال کر چکی تھی۔ میں تبھی سے 'اَماں' لفظ بولنا ہی بھول گئی تھی۔ دل میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا تھا۔ ایسا خلا کبھی نہیں بھرتا۔ اُس انسان کی یاد میں دل کا ایک کونا ہمیشہ ویران رہتا ہے۔ ہاں، اگر کوئی اسی کی طرح کا انسان سامنے آتا ہے تو بہت راحت ملتی ہے اور اس کی گود میں سر رکھنے کے لیے جی مچلتا ہے۔

بات چیت کے دوران پتہ چلا کہ وہ اَماں لگ بھگ چودہ پندرہ سالوں سے سندھیوں سے بالکل کٹ کر اپنی زندگی جی رہی تھی۔ گھر کے سبھی مرد صبح نو بجے گھر سے نکلتے اور رات کے دس بجے کام دھندے سے نپٹ کر لوٹتے تھے۔

اس نے بڑے جوش سے مجھے بھگونتی ناوانی کے کچھ سندھی کیسٹ دکھائے اور کہا "دیکھو، دس سال پہلے یہ میں نے کسی سے خریدے تھے"۔

میں نے شکایت کرتے ہوئے پوچھا "آپ نے اپنے بچوں کے ساتھ سندھی میں بات چیت کیوں نہیں کی؟"

"بیٹا، بٹوارے کے بعد بچے انگریزی اسکول میں پڑھنے لگے۔ سبھی سندھی تتر بتر ہو گئے۔ ہم لوگوں کو بھی نہ جانے کیا جنون سوار ہوا کہ بچوں کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بات کرنے لگے۔ سندھی چھوٹ گئی۔ آج اگر سندھی سنتے بھی ہیں تو سمجھ میں نہیں آتی۔ میں کس کو الزام دوں؟ لیکن ایسی دعا ضرور ہے کہ بھگوان کرے سندھی پھر سے آباد ہو۔"

میں نے اس گھر سے وداعی لی اور اپنے گھر میں ہونے والی میٹنگ کا وقت اور دن بتایا۔ نیتو

نے مسکرا کر کہا "ممی کو ڈرائیور کے ساتھ بھیج دوں گی"۔

میں نے اسے پیار سے کہا "نہ صرف ممی، تمہارا آنا بھی بہت ضروری ہے"۔ وہ بولی "مجھے تو سندھی نہیں آتی۔ تھوڑی بہت سمجھ لیتی ہوں۔ سب ہنسیں گے"۔ میں نے کہا "کوئی نہیں ہنسے گا۔ تمہارے جیسے بہت سے لوگ ہوں گے۔ کیا تم اپنے جیسوں سے ملنا نہیں چاہتی؟"

اسی طرح پیدل چلتے چلتے، بلڈنگوں کے سامنے نیم پلیٹس پڑھتے پڑھتے میں سندھیوں سے ملتی رہی۔ ہر ایک کے گھر کا ماحول دیکھتے، ملتے، سب کو ایک مقررہ تاریخ اور وقت بتاتی جاتی تھی میں۔ چہرہ تو پہچانے ہوئے لگتے لیکن سب نے سندھی ہونے کی پہچان کھو دی تھی اور زبان بھی۔

آخر وہ دن بھی آیا جب سندھیوں کی میٹنگ میرے گھر میں ہونے والی تھی۔ میرے دل میں خیالات کی بھیڑ تھی۔ میں کبھی جذباتی ہوتی تو کبھی جوش سے بھری ہوئی ہنس رہی ہوتی تو کبھی غمگین ہو جاتی۔ میرے اندازے کے مطابق پچیس تیس عورتوں نے آنے کا وعدہ تو کیا تھا۔ پھر بھی مہمانوں کے استقبال کی تیاری کرتے کرتے میرا دل شکوک سے بھر جاتا تھا۔

بیچ بیچ میں میرے بیٹا، بیٹی اور پتی میری حالت دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ میں نے پورا انتظام کر لیا تھا۔ چالیس پچاس لوگوں کے لیے چائے، بسکٹ، چیوڑا تیار کر کے رکھا تھا۔ پڑوسیوں سے کرسیاں اور چائے کی پیالیاں بھی منگوا لیے تھے۔ اگر دو تین ہی لوگ آئے تو کیا ہوگا؟ بچے، پتی، پڑوسی سبھی میرا مذاق اڑائیں گے۔ اُمید- نااُمید کے جھولے میں مَیں جھولتی رہی۔

تھوڑے سے مرد اور بہت سی عورتیں آہستہ آہستہ آنے لگیں۔ قریب اڑتیں چالیس لوگ آگئے تھے۔ میں حیران رہ گئی۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی؟ سبھی ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ کچھ ایک دوسرے کو پہچان رہے تھے لیکن ان کو پتہ نہیں تھا کہ وہ سبھی سندھی ہیں۔ میرے چھوٹے سے گھر میں میلا لگا تھا۔ ہال چھوٹا تھا اسی لیے الگ الگ کمروں میں جہاں کہیں جگہ ملی سبھی بیٹھ گئے۔

میری آنکھیں خوشی سے بھر آئیں۔ چہرہ کھل اُٹھا۔ میں اپنے پتی کی طرف فخر سے دیکھنے لگی، میں ہاری نہیں تھی۔

آدھے گھنٹے تک ایک دوسرے سے ملنا، حیران ہونا چلتا رہا۔ میں ایسی جگہ پر بیٹھی کہ جہاں

سے سبھی لوگ مجھے دیکھ سکیں اور سن بھی سکیں۔ پھر باقاعدہ میٹنگ شروع ہوئی۔ سب نے اپنا اپنا تعارف پیش کرنا شروع کیا۔ میں نے سب کو جھولے لال کا فوٹو بانٹا اور کہا "اپنے اپنے گھر میں سبھی اس فوٹو کو لگائیں۔ یہ سندھی ہونے کی پہچان ہے۔"

کچھ لوگوں نے نئی نسل کو الزام دینا شروع کیا کہ ان لوگوں نے سندھی بولی چھوڑ دی تھی۔ نئی نسل والے بڑوں کو الزام دینے لگے تو بڑے بوڑھے بٹوارے کو اور کچھ انگریزی اسکولوں پر تنقید کرنے لگے۔ ایک دوسرے کو ملزم ٹھہراتے، اپنی اپنی حالت کا احساس کرتے کرتے وقت یوں ہی گزرتا جارہا تھا۔ تبھی نیتو نے کہا "دیدی، ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انگریزی اسکولوں میں سبھی مذاہب کے بچے پڑھتے ہیں، وہ سبھی تو اپنی بولی بولتے ہیں۔ میں نے کسی بھی مہاراشٹرین، گجراتی یا جنوبی ہندوستان کے لوگوں کو اپنے بچوں کے ساتھ دوسری کسی زبان میں بات چیت کرتے ہوئے نہیں سنا ہے۔ گھر میں سبھی اپنی اپنی مادری زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ مراٹھا لوگ ماں کو 'آئی' اور والد صاحب کو 'بابا' کہتے ہیں۔ ہم نے 'ممی'، 'پاپا' کہنا کیوں شروع کردیا؟"

میں کیا جواب دیتی۔ میں خاموش رہ گئی۔ سندھی زبان اور سندھیوں کی ایسی بری حالت؟ سندھی، سندھی سے سندھی زبان میں بات نہیں کرتا، آخر کیوں؟

نیتو میرے ساتھ انگریزی میں بول رہی تھی اور میں بھی انگریزی میں جواب دے رہی تھی۔ سبھی کو اعتراض ہوا۔ سبھی ہنستے ہنستے کہنے لگے "سندھی میں بات کرو۔ یہ سندھیوں کی میٹنگ ہے"۔

میں بھی زور سے ہنس پڑی۔ اس ہنسی کا مطلب میں اور میری بیٹی ہی سمجھ سکی۔ گھر میں یہ لوگ ہندی، مراٹھی، انگریزی زبانوں میں بات کرتے ہیں۔ آج سندھی پن کے جذبے میں بہہ کر پل بھر کے لیے ہی کیوں نہ ہو سندھی میں بات کرنے پر زور دے رہے ہیں۔

اچانک کسی نے پوچھا "سندھیوں کے اس جلسے کا خیال کیسے اور کیوں آیا آپ کو؟ اتنے بڑے علاقے میں بکھرے بکھرے سے گھر ہیں۔ راستے پر گزرتے ہیں تو پتہ نہیں چلتا کہ کون پنجابی، کون مراٹھا یا کون سندھی ہے؟ معمر افراد تو ٹی وی ویڈیو سے چپکے گھروں میں بند رہتے ہیں؟ پھر سندھیوں کو ملانے کی آج کون سی وجہ ہے؟"

اس سوال سے میں بہت جذباتی ہو گئی۔ رونے کو جی کر رہا تھا۔ روؤں! لیکن......!

اپنے جذبات اور رُلائی کو دبانے کے لیے میں نے پانی کے گلاس کا سہارا لیا۔ سوچنے کے لیے کچھ وقت ملے اس لیے میں دھیرے دھیرے پانی پینے لگی۔

سب کی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ ایک عورت سفید ساڑی پہنے، گردن جھکائے وہاں بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کی وجہ سے"۔

سب لوگوں نے چونک کر اُس عورت کی طرف دیکھا، اس کی جھکی ہوئی گردن اور بھی جھک گئی۔ اس کے گالوں پر آنسو تھے۔ میں نے اپنی سندھی کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس سندھی کتاب کی وجہ سے اور آپ سب کے لیے۔ یہ گردن جھکائے اور سفید ساڑھی پہنے بیوہ عورت محترمہ وادھوانی ہیں۔ اس کالونی میں یہ چار مہینوں سے ہیں۔ ان کے شوہر کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ کسی سے ان کی پہچان نہیں تھی۔ فون بھی نہیں ہے۔ کوئی مدد کرنے والا نہیں تھا۔ تین چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ٹھیک وقت پر مدد نہ ملنے سے ان کے پتی گزر گئے۔ اَرتھی اُٹھانے کے لیے چار لوگ ملنا بھی مشکل تھا۔ دوسرے لوگ سوچ رہے تھے کہ نہ جانے ان سندھی سائیوں میں کون سی رسم و رواج ہے؟ اس لیے وہ بھی مدد نہیں کر سکے۔ کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانک کر دیکھ رہے تھے لیکن سامنے کوئی نہیں آیا کہ کون ان کے جھمیلے میں پڑے۔

مسز وادھوانی نے کہنا شروع کیا "میں بار بار بے ہوش ہو رہی تھی۔ بچے رو رہے تھے۔ ان کے لیے کھانا کون پکائے؟ میں خود ہی بے حال تھی۔ میرے ہوش ٹھکانے نہیں تھے۔ ایمبولینس، آخری رسوم تک نوکر، واچ مین نہ جانے کون کون سے لوگوں کو پیسے دیدے کر کرائے۔ کاش! کوئی اپنا ہوتا! کوئی میرا دُکھ بانٹتا، دل کو دھیرج دیتا۔ بچوں کو کھانا کھلاتا۔ کوئی تو ہوتا؟" اتنا کہتے کہتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

ہندوستان اور پاکستان کے بٹوارے میں رشتہ دار ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں۔ اپنی سرزمین سے دور ہوئے سندھی اپنی تنہائی کا احساس بڑی شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ دل کی تنہائی، تہذیب اور اقدار کی تنہائی، زبان کی تنہائی...... یہ تنہائیاں سبھی سندھیوں کو ڈنک مارتی ہیں۔

پھر تو قصوں کے بعد قصے ...... سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک نے کہا، ایک بار چتر شرنگی کے بنگلوں والی کالونی میں ایک سندھی عورت کا انتقال ہو گیا۔ وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ عورتیں نہ ملنے پر اس کی بارہ سال کی بیٹی نے اپنی ماں کے جسم کو غسل دیا۔ وہ لڑکی یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی اور اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ بہت دن تک کسی نفسیات کے ڈاکٹر سے اسے علاج کرانا پڑا۔ وہ لڑکی اس واقعہ کو بالکل بھول نہیں پا رہی تھی۔

یہ سن کر سب کے چہرے پیلے پڑ گئے۔ ایک بوڑھی اُماں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "اری! کتا بھی اپنے ساتھیوں کے بیچ اچھا لگتا ہے"۔

پچھلے سال تلسی داس اپارٹمنٹ میں ایک بوڑھا سندھی گزر گیا۔ وہ لوگ پانچویں منزل پر رہتے تھے۔ وہاں لفٹ بھی نہیں تھی۔ اس کی بوڑھی گھر والی کو آخری رسومات کے لیے نا کوں چنے چبانے پڑے'۔

ایک سندھی بولے 'کسی غیر سندھی سے تھوڑی لڑائی ہوتی ہے تو ان کے سو لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم کیا کریں؟"

ماحول بہت بوجھل ہو گیا تھا۔ سب اپنا اپنا دل ہلکا کر رہے تھے۔ نیتو نے اپنے تین سال کے بچے کو آگے بڑھا کر کہا 'گڈو بیٹا! بولو 'جھولے لال! میں سندھی ہوں!"

اس بچے نے توتلی زبان میں سندھی میں کہا 'ماں سندھی آہیاں! جھولے لال!"

بس پھر تو نعرے لگنے لگے 'جھولے لال بیڑا ای پار' (جھولے لال ہمارا بیڑا پار لگایئے)

اور نیتو مسکرانے لگی۔ بوڑھی اماں آشیرواد دیتے ہوئے کہنے لگیں "لال سائی کی مہربانی سے سب سکھ دکھ کے ساتھی ہو جائیں۔ ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔ سب بچھڑے سندھی آپس میں ملیں۔ اکیلے پن کا جذبہ دور ہو"۔

بوڑھی اُماں اوڑھنی کا سرا پکڑے دعا کر رہی تھیں اور سب خاموش ہو کر سندھی اُماں کی دعا سنتے رہے، 'پلؤ پانے میں' شامل ہو گئے۔



تمہارے نصیب کھل گئے

آخراس نے کون سا قصور کیا ہے؟ قسمت کی اس کے ہی ساتھ دشمنی کیوں ہے؟ اس نے کس کا کیا بگاڑا ہے؟ اس نے کس کو غم دیا ہے؟ کس کے گھر میں آگ لگائی ہے؟ کس کا برا چاہا ہے؟ پھر یہ مصیبت کے پہاڑ اس کے اوپر ہی کیوں گرتے ہیں؟ وہ جب سے کچھ سمجھنے بوجھنے لائق بنی اس نے سکھ نہیں دیکھا۔ آخر ایسا سب کچھ اس کے ساتھ ہی کیوں ہوا؟

وہ اپنے گھر میں سب بچوں سے پہلے پیدا ہوئی۔ پہلی اولاد بیٹی ہوتے ہوئے بھی اس کا بہت استقبال کیا گیا۔ دادی، بوا، چاچی سبھی لوگوں نے خوب خوشیاں منائیں۔

رَجنی کو ایسا محسوس ہوا کہ سب سے خوبصورت اس کے بچپن کے دن تھے جو پیار کی چھاؤں میں بیتے۔ دادی کی کہانیاں، راکشش، راجا رانی، راج کماروں کی کہانی، بوا کا پیار، چاچی کا لاڈ۔ لیکن یہ کیا ہوا کہ دوسرے سال دیپک، ایک دیڑھ سال کے بعد لتا، چوتھے سال جیوتی، پانچویں، چھٹے اور ساتویں سال رمیش، ہریش، اَنیتا اور اس کے بعد بھی دو چار بچے ماں کو جو ہوئے وہ سبھی بھگوان کو پیارے ہوگئے۔ دیکھتے دیکھتے وہ پلنگ سے اُتار کر زمین پر سلائی گئی اور پھر زمین سے پلنگ کے نیچے۔ آٹھ نو سال کی عمر میں مانو وہ دو تین بچوں کی ماں بن گئی۔ بچوں کو کھیل کھلانا، چائے پلانا، اُن کے کپڑے بدلنا۔ اس کے بچپن کا عرصہ بہت ہی چھوٹا ہو گیا۔

"تم سب سے بڑی ہو" ہر وقت یہ جملہ سن کر بے خبری میں وہ پہاڑ جیسی بڑی بن گئی۔ گھر سے خوشی کافور ہو گئی تھی۔ کمائی نہیں بڑھی۔ گھر کے لوگ بڑھتے گئے۔ بوا نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ نوکری شروع کر دی۔ رَجنی کو یاد آیا بوا نے بہت چاہا اور کوشش کی کہ سب بچے پڑھیں لیکن

ایسا نہ ہو پایا۔ رَجنی کے چھوٹے بھائی بابو جی کے ساتھ نوکروں کی جگہوں پر کام کرنے لگے۔ کچھ پیسہ ہاتھ صاف کر کے اپنا سنیما کا شوق بھی پورا کرنے لگے۔ کھانے پینے کی چیزوں میں مست رہنے لگے۔ اسکول میں جانے اور پڑھنے کے لیے وہ تیار نہیں ہوئے۔ بوا نے بڑی لگن اور چاہت سے اسے پڑھایا۔ گھر میں سب سے زیادہ پڑھی لکھی وہی تھی۔ دوسری لڑکیاں کچھ نہ پڑھ سکیں۔

رَجنی کو کسی دکان پر سیلس گرل کا کام مل گیا۔ گھر کا خرچ بڑھتا گیا لیکن اس کے بابو جی کی کمائی نہ بڑھی۔ دوکان کے آگے کا راستہ بڑھانے کے جرم میں دکان کا آدھا حصہ بھی کٹ گیا۔ اچھی خاصی ہوٹل چائے کی ایک چھوٹی دکان بن گئی۔ اس کے بھائی بری صحبت میں اور بری عادتوں میں پھنستے گئے اور تین بہنیں اپنے ڈیل ڈول میں جلدی جلدی اتنی بڑی ہوتی گئیں کہ بابو جی کی آنکھیں جھک جھک جاتی تھیں۔ یہ قدرت کا غریبوں پر ظلم ہی ہے کہ غریبوں کی بیٹیاں روکھا سوکھا کھا کر بھی جسم سے بہت بھاری اور بہت جلدی بڑی ہو جاتی ہیں۔ اس عمر میں امیروں کی بیٹیاں اپنے آپ کو "بے بی" کہلاتی ہیں۔ بہنوں نے اپنے نصیب سے نہ جانے کیسے کیسے سمجھوتے کر کے اپنے آپ کو حالات کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ بابو جی نے ان سے کسی بھی قسم کے سوال کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جیسے کپڑے دوائیاں یا گھر میں کوئی بھی نئی چیز کیسے آ رہی ہے؟ بابو جی میں ہمت ہی نہیں کہ ایسے سوالوں کے جواب وہ سن سکیں۔ وہ تو غریبی کی چکی میں بالکل ہی پس گئے تھے۔ زندگی سے اُنھیں جانے کیسے کیسے سمجھوتے کرنے پڑے۔

اُس کی عمر بڑھنے لگی۔ دادی ماں اور بوا کو فکر ستانے لگی۔ بوا نے صاف الفاظ میں کہا "اب اس لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دو"۔ سن کو بابو جی اور ماں وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے۔ میں کیسے ہاں کہتی؟ گھر میں جو تھوڑی بہت آمدنی میں لاتی تھی وہ بند ہو جاتی اور گھر میں بھوکے مرنے کی نوبت آتی۔ دوسری بہنوں نے چوتھی چھٹی پڑھ کر پڑھائی بند کر دی تھی اور کوئی کام بھی نہیں کرتی تھی۔ بوا کی شادی کے بعد اس گھر میں بس میں ہی ایک کمانے والی تھی۔

بابو جی کی قسمت بہت اچھی تھی کہ بوا نے کسی شریف انسان کی مدد سے تین لڑکیوں کی شادی کروادی۔ لڑکے دال روٹی کما لیتے تھے۔ چھوٹی بیٹی اَنیتا کی بھی شادی ہو گئی تھی اور وہ اب بتیس سال کی ہو گئی، پھر بھی کسی کو اس کی شادی کی فکر نہیں تھی۔

اس نے کہاں غلطی کر دی؟ وہ تو بابوجی اور ماں کا غم بانٹنا چاہتی تھی۔ ان کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ اس کی سبھی بہنیں اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ گھر میں آتی تھیں۔ ٹھاٹھ سے کھا پی کر گھر گندا کر کے برتنوں کے ڈھیر چھوڑ کر پچیس پچاس روپے ماں کے ہاتھ میں تھما کر چلی جاتی تھیں۔ ماں کی طبیعت پہلے سے ہی خراب رہتی تھی۔ اب اور بگڑتی جا رہی تھی۔ گھر کے زیادہ کام کاج کو دیکھ کر وہ گھبرا جاتی تھی۔ رَجنی ہی ڈھیر سارے برتن مانجھتی اور جھاڑو کٹکا کرتی تھی۔ اس کے جسم کا ہر حصہ دُکھنے لگتا تھا۔ اس کے من میں جلن، روح غمگین، جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوتا جا رہا تھا۔ بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں چڑچڑاپن آتا جا رہا تھا۔

آخر ایک دن اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اس سے اب اور نہیں برداشت ہو رہا تھا۔ لاج شرم کو طاق پر رکھ کر اس دن اس نے کہہ ڈالا "ماں! اب میری بھی شادی کروا دو"۔ سن کر گھر میں جیسے ایک بم پھٹا۔ بے شرم، بے غیرت نہ جانے کیا کیا بابوجی کہتے رہے۔ ماں نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا "میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ یہ اپنی بہنوں سے جلتی ہے"

بوا کے کان تک بات پہنچی۔ اس نے کوشش کی لیکن کنوارا لڑکا اس عمر میں اسے کہاں سے ملتا؟ اس کی ضد تھی کہ بچوں والے سے وہ ہرگز شادی نہیں کرے گی۔ سب حیران اور پریشان ہو گئے۔ آخر شادی کرانے والا ایک برہمن مل گیا۔ جس نے پینتیس چالیس کی عمر کا وہ لڑکا ڈھونڈا جو بغیر ماں باپ کا تھا۔ اس کی تنخواہ نو سو روپے تھی۔ وہ کسی ہوٹل میں منیجر کی نوکری کرتا تھا۔ اس نے ہاں کہہ دی۔

شادی کے بعد رَجنی نے نوکری چھوڑ دی۔ دیپک کماتا تھا۔ وہ ٹھاٹھ سے گھر کا کام کرتی۔ ایک کمرے والی دنیا میں وہ اپنے آپ کو رانی سمجھتی تھی۔ برتن مانجھ کر چمکاتی۔ کھانا اتنا لذیذ بناتی تھی کہ دیپک اُنگلیاں چاٹتا رہ جاتا۔ اسے پیٹ بھر کھاتے دیکھ کر وہ مطمئن ہوتی تھی۔ اپنے کام اور پیار سے اس نے دیپک کی دنیا میں زمین پر بھی جنت لا دی تھی۔ راجا رانی کی خوشحال دنیا میں اولاد کی کمی تھی سو وہ بھی پوری ہو گئی۔

پانچ سال گرہستی نبھانے کے بعد رَجنی کو یہ جانکاری ملی کہ دیپک شرابی تھا۔ اس لیے اس کی شادی بھی کہیں نہیں ہو پا رہی تھی۔ شادی سے کچھ مہینے پہلے یار دوستوں اور رشتہ داروں کے سمجھانے پر اس نے شراب چھوڑ دی تھی۔ اب شادی ہو گئی، بچے بھی ہو گئے تھے۔ بیوی چھوڑ کر

تھوڑے ہی جائے گی؟ اس نے پھر سے شراب پینی شروع کر دی تھی۔ رَجنی نے سوچا اب پھنس ہی گئی ہوں تو چیخنے چلانے سے کیا فائدہ؟ کیوں نہ بہادری سے سچائی کا سامنا کروں؟ اس نے پہلے ہاتھ پیر جوڑ کر دیپک کو سمجھانے کی کوشش کی۔ پھر تھوڑی سی شراب گھر میں پینے کی اجازت دے دی لیکن زیادہ شراب پینے کی وجہ سے دیپک کی صحت بگڑتی ہی جا رہی تھی۔ ایکس رے کرانے سے پتہ چلا کہ اس کی آنتیں، گردے، پھیپھڑے سب خراب ہو چکے تھے۔ رَجنی کبھی کسی گڑھے سے، کبھی گٹر سے، کبھی شراب کے اڈّوں سے دیپک کو نشے کی حالت میں اُٹھا کر گھر لاتی تھی۔ دیپک نے اب کام پر جانا بھی بند کر دیا تھا۔ گھر میں غریبی کی بیماری پھیلنے لگی۔ چار پانچ سالوں کے اندر آہستہ آہستہ گھر کا ایک ایک سامان بک گیا۔

اس کے اُس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے خوددار رَجنی بہت ہی شرمندہ ہو رہی تھی۔ قرض کون دیتا؟ رَجنی کی اس حالت پر رحم کھا کر کچھ لوگ اگر اسے کچھ دیتے بھی تو خیرات سمجھ کر دیتے تھے۔ جو کبھی واپس ملنے والا نہیں تھا۔ بھیک کوئی کب تک دیتا؟

آخر سب کے ہمت بندھانے پر رَجنی پھر اسی دکاندار کے پاس گئی جہاں وہ شادی سے پہلے نوکری کرتی تھی۔ اس کی حالت پر ترس کھا کر دکاندار نے اسے نوکری پر رکھ لیا۔ آٹھ سو روپے مہینہ تنخواہ طے ہوئی۔ اب رَجنی کی ذمہ داریاں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئیں۔ دو بچوں کی ذمہ داری، سارے گھر کا کام کاج، شرابی پتی کی خدمت اور اپنے خوابوں کا ایسا انتشار دیکھ کر وہ غمگین ہو جاتی تھی۔ کیا خواب تھا اس کا؟ ایک چھوٹا سا گھر، کمانے والا پتی اور بچے۔ اپنی بہنوں کی قسمت دیکھ کر جو قدم اُٹھایا تو یہ ملا اسے۔ آرام اور چین سے رہنا اس کے نصیب میں کہاں؟ کام کے بوجھ سے، دکھ اُٹھا اُٹھا کر وہ ایک جیتی جاگتی لاش بن گئی تھی۔ دُبلا پتلا جسم اور بہت کڑی محنت دکان اور گھر پر کرنی پڑتی تھی۔ اس کے پتی کا روز شراب پی کر آنا۔ پھر شراب نہ پینے کی قسم کھانا۔ اس کا روز رونا۔ پاس والی ریل کی پٹریوں کی طرف بھاگنا۔ یہی سلسلہ چلتا رہا۔

آخر جگر خراب ہونے سے دیپک کا انتقال ہو گیا، وراثت میں رَجنی کو دو بچے، قرض اور ذمہ داری دے گیا۔ رَجنی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ روئے؟ اس انسان کیلئے جسے پتہ تھا کہ وہ شراب پی کر دنیا میں بہت تھوڑے دنوں تک زندہ رہنے والا ہے۔ پھر بھی شادی کر کے دو بچے

پیدا کیے۔ اسے دماغی اور جسمانی پریشانی، بدنامی دیکر خود ساری ذمہ داریوں سے آزاد ہو کر وہ چلا گیا۔

بڑھتی مہنگائی، مکان کا کرایہ، دو بچوں کی پڑھائی کا خرچ، پڑھانے سے بھی بڑھ کر ان کو پالنا۔ کون سنبھالے گا اُن بچوں کو؟ وہ صبح نو بجے سے رات کے نو بجے تک دکان پر کام کرتی۔ کسی نے صلاح دی کہ کام والی بائی رکھ لو جو بچوں کو سنبھالے گی۔ بچوں کو سنبھالنے کے لیے ایک عورت مل گئی۔ کھانے پینے کے علاوہ اس نے پانچ سو روپے مانگے۔ دیپک گھر میں ہوتا تھا تو بچوں کو سنبھالنے کی فکر اسے نہیں تھی۔ اس نے حساب کرنا شروع کیا کہ ڈیڑھ سو روپے مکان کا کرایہ اور بائی کے پانچ سو روپے تو باقی بچے ڈیڑھ سو روپے میں بس کا کرایہ، کرانے والے کا بل، بیماری وغیرہ کیا کیا کروں؟ اپنا جسم بڑا، چادر چھوٹی، سر کو ڈھانکتی تو پیر ننگے ہو جاتے اور پیروں کو ڈھانکتی تو سر ننگا رہتا۔ "کیا کرے وہ؟ کتنی حسرت تھی ماں بننے کی۔ بچوں کے لیے کتنی نظمیں پڑھا کرتی تھیں۔ لوریاں یاد تھیں اسے۔ اب اسے اپنے بچوں سے ہی الگ ہو کر دن بھر کھڑے رہ کر، ہر قسم کی چالاکیاں کر کے اپنے مالک کی دکان کا مال بیچنا پڑتا تھا۔ رونے کو دل کرتا لیکن وہ ہنستی مسکراتی زندگی کی کشتی کو آگے بڑھاتی۔ آٹھ سو روپے تنخواہ سے اپنے پیٹ میں کیا ڈالوں؟ ان بچوں کا پیٹ کس چیز سے بھروں؟ سوچ سوچ کر اس کا دماغ چکرانے لگتا تھا۔

اس نے دل ہی دل میں ذمہ داری لفظ کو دو چار بار دہرایا۔ نہ جانے کیوں اس لفظ سے پہلی بار اسے نفرت سی ہونے لگی۔ یہ احساس اسے زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں جب اس نے میکے میں اپنے گھر کی ذمہ داری اُٹھائی تھی تو وہ اپنے آپ کو ہندی فلموں کی ہیروئین سمجھنے لگی تھی لیکن اب اسے ذمہ داری لفظ بے معنی اور بے کار سا لفظ لگنے لگا۔ اس کا کمزور جسم کام اور ذمہ داری بڑھنے سے بہت ہی کمزور ہوتا جارہا تھا۔ کھانسی، بخار، کم کھانے سے سارا جسم تھرتھر کانپتا تھا۔ سر چکراتا رہتا تھا۔ چہرہ بھیانک ہوتا جارہا تھا۔ آخر لوگوں کے کہنے پر ایک سرکاری اسپتال میں ایکس رے نکالا۔ معلوم ہُوا اُسے ٹی.بی. ہوگئی ہے۔ وہ بھی آخری اسٹیج پر بڑھ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا' آپ کو فکر نہیں کرنی چاہیے۔ فکر آپ کی بیماری کے لیے نقصاندہ ہے۔ اچھا کھانا کھانا ہے، طاقت کے لیے قیمتی دوائیاں خریدنی ہیں۔ کم سے کم دو تین مہینے آرام کرنا ضروری ہے۔ دیکھئے! فکر کی کوئی بات نہیں" رَجنی بہت زور سے ہنس پڑی۔ ڈاکٹر صاحب چونک گئے۔ "میری ہنسی کا مطلب

آپ نہیں سمجھ پائیں گے ڈاکٹر صاحب! اس ایئر کنڈیشن کمرے میں بیٹھ کر آپ کی بتائی ہوئی چیزیں میں کبھی نہیں کر پاؤں گی"۔

آس پاس کے لوگوں نے اور پڑوسیوں نے ہمدردی جتائی لیکن اس سے تو مسئلے حل نہیں ہوئے۔ پہاڑ جتنے دکھ نہیں ہٹے۔ کیا کروں؟ پیسہ! پیسہ!! پیسہ!!! کیا ممتا پر بھی امیروں کا ہی حق ہے؟ خالی پیٹ، بیمار جسم، زخمی روح سے وہ اداس، چڑچڑی اور کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ بوڑھے تن اور من والی بنتی جا رہی تھی۔

کیا کروں؟ بچوں کے ساتھ ندی میں کود پڑوں؟ ریل گاڑی کے نیچے کٹ کے مر جائیں؟ کیا موت ہی اس مسئلہ کا حل ہے؟ ہم سب مر جائیں؟ ساتھ میں جینا کتنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن ہم مریں ہی کیوں؟ میں بہت بیمار ہو چکی ہوں۔ کام کرنے کی طاقت بالکل ہی نہیں ہے۔ بچے بھوک سے مر جائیں گے ایسی موت تو خودکشی سے بھی زیادہ خراب ہے۔ کیا کروں؟ بچے زندہ رہیں ایسی کوئی ترکیب نکالنی ہوگی۔ الگ الگ ہی سہی ہم زندہ تو رہ سکیں گے۔

اسے بچپن کا ایک واقعہ یاد آیا۔ گھر میں پالی ہوئی ایک کتیا نے ڈھیر سارے بچے پیدا کیے تھے۔ ماں نے سارے پلّوں کی ایک گٹھری باندھ کر کہا تھا انھیں کہیں بہت دور پھینک آؤ۔ دادی نے اسے کہا تھا بچوں کو بہت دور پھینک آنا جہاں سے وہ گھر پہچان نہیں سکیں اور کتیا سے بہت چھپا کر لے جانا، وہ دیکھے گی تو پاگل ہو جائے گی۔ اپنے بچوں سے ماں کبھی دور نہیں رہ سکتی اور ہم کتیا کے بچوں کو پال نہیں سکیں گے۔ نہ جانے آج اس کی یادداشت اتنی تیز کیوں ہو گئی۔ اسے وہ واقعہ ایسے یاد آیا جیسے ابھی ابھی ہوا ہو۔ آج یہ واقعہ مجھے کیوں یاد آ رہا ہے؟ یادداشتوں کا بھی واقعات کے ساتھ ضرور کوئی نہ کوئی رشتہ ہوتا ہے۔ اسے رونا آ گیا۔ اس نے بچوں کو تیار کیا اور پڑوسیوں سے کہا "آلندی جا رہی ہوں یاترا میں شامل ہونے کے لیے"۔

کتیا اور اس کے پلّوں کی کہانی دہراتی ہوئی وہ اپنے دونوں بچوں کو میلے میں چھوڑ آئی۔ جہاں بھی رہیں دونوں بچے زندہ تو رہیں۔ دعا کر کے تو وہ ایک ساتھ زندہ رہنا ناممکن ہوتا جا رہا ہے، الگ الگ رہیں تو شاید زندہ رہیں۔ وہ گھر میں اکیلی لوٹ آئی تھی لیکن کتیا کی طرح پاگل نہیں ہوئی۔ روح چھوڑ آئی تھی وہ اور اپنا پرانا بیکار جسم لے آئی تھی۔ لوگوں کے پوچھنے پر اس نے کہہ دیا

کہ میرے بچے میلے میں گم گئے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی لیکن وہ مجھے کہیں نہیں ملے۔ روتے روتے بے حال ہو گئی ہوں۔ کیا کرتی اکیلی ہی لوٹ کر گھر آ گئی۔

نوکری تو اس نے چھوڑ ہی دی تھی۔ دو تین دنوں میں اس نے ایک مذہبی ادارے سے تعاون مانگا۔ اس ادارہ نے تین سو روپے مہینہ مدد کرنا شروع کی۔ ڈیڑھ سو روپے مکان کا کرایہ، پانچ روپیہ روز دو وقت کا کھانا، چائے پانی ہو جاتا تھا اس میں۔ اس نے من ہی من حساب کیا اور سوچا، ٹھیک ہی ہے۔ ایک عجیب سی زندگی! پھٹی ہوئی ساڑیاں، ٹوٹے پھوٹے جوتے، پرانے کمبل، کچھ کلو چاول، کچھ کلو گیہوں، کچھ دوائیاں، مہینے میں ایک بار وہ اس لائن میں شامل ہو جاتی تھی۔ بھیک نہیں، بھیک تو بہت ہی برا لفظ ہے مدد لینے والوں کے لیے۔

اب کیا؟ اب تو آرام ہی آرام ہے۔ ڈاکٹر نے بھی آرام کرنے کے لیے ہی کہا تھا۔ صبح کے وقت چائے پی کر وہ اپنے لیے دو وقت کی روٹی بنا کر دوائیاں لے کر صرف سوتی رہتی تھی۔ بس کھانا کھانے کے لیے اور ضروری معمولات کو پورا کرنے کے لیے ہی اُٹھتی تھی۔ زندگی بھر کی تھکاوٹ مٹانے کے لیے سوتی ہو وہ جیسے۔ کسی کی فکر نہیں، کسی کی بھی ذمہ داری نہیں۔ اب کس کے لیے جینا ہے؟ صرف موت کا انتظار، باقی کچھ نہیں۔

رَجنی کسی سے بھی بات چیت نہیں کرتی تھی۔ کھاتی تھی اور سوتی تھی۔ دوا کھاتی تھی۔ کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ مَر گئی ہے۔ اسے اپنا کمرا ایک قبر کے جیسا لگتا۔ اس میں زندگی کا کوئی جوش نہیں تھا۔ لیکن وقت وقت پر بھوک اور پیاس لگنا اسے اپنے زندہ ہونے کا یقین دلاتا تھا۔

ایک دن زور زور سے آدھی رات کو کوئی دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ باہر سے بہت سارے لوگوں کی آوازیں آنے لگیں۔ بہت دیر تک رَجنی کسل مندی اور کمزوری کی وجہ سے دروازہ کھول نہیں پائی۔ آخر کانپتی ٹانگوں سے وہ اُٹھی، دروازہ کھولا تو موتی کی ماں نے کہا "مائی بدھائی ہو! تمہارے دونوں بچے مل گئے۔ اپنا تکارام آلندی گیا ہوا تھا۔ ان دونوں بچوں کو پہچانا اور اپنے ساتھ لے آیا"۔ دونوں بچے اس کے سامنے تھے اور گلے ملنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔

رَجنی بیہوش ہونے لگی اور چکرا کر گرنے ہی والی تھی کہ موتی کی ماں کی آواز پھر سے اس کے کانوں میں پڑی "مائی تمہارا تو نصیب کھل گیا جو کھوئے ہوئے بچے مل گئے"۔



پونم

پونم واسوانی پچیس سال کی نوکری کے بعد کلرک کی کرسی سے ریٹائر ہو رہی ہے۔ جبکہ اس سے کم وقت تک کام کرنے والے اور کم صلاحیت والے بھی آگے بڑھ گئے تھے۔ اسٹاف کی طرف سے آج پارٹی تھی اور تحفے بھی مل رہے تھے۔ ریاضت کے نور سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

میٹنگ کے آخر میں اس نے دو لفظوں میں صرف یہی کہا "اس آفس سے میں نے صبر اور برداشت کرنے کا سبق حاصل کیا ہے اور اپنے ارادوں پر اٹل رہنا سیکھا ہے۔ شکر گزار ہوں میں اِن تجربات کی"۔

باس کی آنکھوں میں آنسو چھپے تھے اور مسز ملسکھانی کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ گلے میں ہار پہنی ہوئی ہاتھوں میں گلدستہ لی ہوئی پونم واسوانی ایک نورانی دیوی جیسی دِکھائی دینے لگیں۔ چپراسی آگے بڑھ کر اس کے پاؤں چھو رہے تھے۔ ہنستی مسکراتی آنکھوں میں آنسو چھپائے ہوئے عاجزی و انکساری کی وہ مورتی آفس سے چلی گئی۔

میں اس کے آفس میں ایک کلرک تھا۔ مجھے یاد آنے لگا آفس کا وہ منظر......

"باس نے آپ کو بلایا ہے"۔

چپراسی کی آنکھوں میں شرارت تھی اور پونم کی آنکھوں میں ڈر، ہم سب کے کان کھڑے ہوگئے۔ پونم کے ہونٹ کانپنے لگے۔

اسٹاف کو معلوم تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ مسز مایا ملسکھانی کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکان تھی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ٹھاٹھ سے اس نے ایک چپراسی کو گولڈ اسپاٹ لانے کا حکم

دیا۔ نفرت، جلن اور مکاری بھری نظروں سے وہ پونم واسوانی کی طرف دیکھنے لگی۔

پونم نے باس کے ذریعے منگائی ہوئی فائل ٹیبل سے اُٹھائی اور فائل کیے ہوئے کاغذ پھر سے تھوڑے ٹھیک کیے، پیشانی پر آئی ہوئی پسینے کی بوندوں کو پونچھا، تھوڑا سا پانی پی کر اَنمنی سی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اب کیا ہوگا؟ آفس کے سبھی ملازمین کو معلوم تھا۔ ہم ایسا تماشہ بار بار دیکھ چکے تھے۔ پونم جیسے ہی صاحب کے کیبن میں جائے گی باس زور زور سے باتیں کرنے لگے گا۔ اس کی نہ کی ہوئی غلطیاں نکالنا شروع کرے گا۔ اس کے ہر ایک کام سے غلطیاں نکالے گا، اُسے ڈانٹے گا اور کہے گا کہ اپنی تحریر سدھارو۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے مچھر اُڑ رہے ہیں۔ آپ کوئی بھی کام ایمانداری سے اور من لگا کر کیوں نہیں کرتیں؟ آپ کا سارا وقت میک اَپ ٹھیک کرتے ہوئے اور ٹھنڈا گرم پیتے ہوئے برباد ہوتا ہے۔ بہت بات کرنے کی بھی آپ کو بری عادت ہے۔ پھر کام ٹھیک کیسے ہوگا؟ شریمتی منسکھانی کی مثال لو، آپ سے جونیئر ہوتے ہوئے بھی انھوں نے کتنی ترقی کی ہے، کتنے پروموشن ملے ہیں۔ کتنی عزت افزائی اس آفس میں ہوتی ہے ان کی! جب وہ ڈانٹ پھٹکار سن کر باہر قدم بڑھائے گی تو باس کی آواز سنائی دے گی، "بھارت آپ جیسے لوگوں کی وجہ ہی سے پیچھے رہ گیا ہے"!

ہم سب جانتے ہیں کہ شریمتی پونم پر لگائے گئے سارے الزامات غلط ہیں۔ اس کے تمام اوصاف کو ڈھک کر، اسے ذلیل کرنے کی بیکار کوشش کی گئی ہے۔ کورووں کے بھرے ہوئے دربار میں، دروپدی کی توہین دیکھنے کی ہمیں عادت پڑ گئی ہے۔ وہ وقت کی پابند، ایماندار، میک اَپ سے کوسوں دور بھاگنے والی، موتی کے دانوں جیسے خوبصورت حروف، کام صاف ستھرا، اچھے اخلاق والی اور بہت کم بات کرنے والی تھی۔ پورے اسٹاف میں وہی زیادہ کام کرتی تھی۔ باقی ہم میں سے بہت سے لوگ بیکار وقت گنوانے والے تھے۔ اس کے کام کرنے کی لگن دیکھ کر ہمیں شرمندگی ہوتی تھی۔

ایک سال پہلے تک باس اس کے کام کرنے کی لگن، طریقے اور اس کے اخلاق کی تعریف کرتا تھا۔ ایک چھوٹا پروموشن بھی اسے ملا تھا۔ اسٹاف کے لوگ بھی خوش تھے۔ وہ مانتے تھے کہ کسی لائق اور صحیح انسان کے کام کی عزت افزائی ہوئی ہے۔ وہ بہت اچھی شخصیت والی اور ملنسار

عورت تھی۔

ہم آفس میں کام کرنے والے مرد اس کی جسمانی خوبصورتی کی تعریف کرنا تو دور بلکہ اس کی غیر حاضری میں بھی اس کے بارے میں غلط خیال کسی کے دل میں نہیں آتا تھا۔ اس کا پر نور اور مہربان چہرہ دیکھ کر پوجا کرنے کو دل چاہتا تھا۔ اس کی شخصیت میں روحانی پاکیزگی کی جھلک تھی۔

کچھ مہینے قبل ایک منحوس واقعہ رونما ہوا۔ ہم صرف دو تین لوگ ہی آفس میں اوور ٹائم کر رہے تھے کہ اچانک چپراسی نے آکر شریمتی واسوانی کو کچھ کہا اور چلا گیا۔ وہ ایک فائل ہاتھ میں لے کر باس کے کیبن میں گئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد کیبن سے سناٹے دار چانٹے کی آواز آئی۔ کچھ دیر سناٹا سا چھایا رہا پھر کیبن سے پونم باہر نکلی۔ اس کی آنکھیں لال، بال بکھرے بکھرے، چہرے پر غصہ، مجھے تو وہ سر تا پا درگا دیوی نظر آئی۔ ماں چنڈیکا کا روپ۔ وہ جلدی جلدی آفس کے دروازے سے باہر نکل گئی۔

پھر ایک ہفتے تک وہ آفس میں نہیں آئی۔ ہم نے سمجھا کہ اس نے ملازمت چھوڑ دی ہے۔ جس دن وہ آئی تو بالکل بدلی ہوئی نظر آئی۔ تھکی ہوئی، پیلا چہرہ اور اُداس مانو کسی نے اس کا سارا خون چوس لیا ہو۔ ہم میں سے کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے کچھ پوچھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بہت بڑی مجبوری کی وجہ سے وہ اس آفس میں دوبارہ آئی ہے۔ شاید روزی روٹی کا جال ہوگا یا پھر کرسی پر بیٹھے ایک گنہگار شخص کو اس کے کیے ہوئے گناہ اور غلطی کا احساس دلانے کے لیے وہ شاید دوبارہ آئی تھی۔

بس اُسی دن سے اسے تنگ کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے اخلاق اور کام میں غلطیاں نکالنا شروع ہوئیں۔ اس حادثے کے بعد مسز ملسکھانی کی اہمیت بہت ہی بڑھ گئی۔ پونم سے جونیئر ہوتے ہوئے بھی اس کو پروموشن ملتے گئے۔ اس کی شرارتیں اور مستی بھی بڑھتی گئیں۔ وہ ہر اس موقعے کی تلاش میں رہتی تھی کہ کسی بھی طرح پونم کی توہین ہوتے رہے۔ اس سے جیسے اس کی انا کو تسکین ملتی تھی۔ افسوس! ایسا کیوں ہوتا ہے کہ عورتیں ہی عورتوں کو نیچا دِکھانے کی سازش میں لگی رہتی ہیں اور مرد اس کا فائدہ اُٹھاتا ہے۔ آج تک یہ سلسلہ نہ کبھی بدلا ہے اور نہ کبھی بدلنے کی اُمید دِکھائی دیتی ہے۔

میں من ہی من مایا منسکھانی سے نفرت کرنے لگا۔ نالائق اور بے حیا عورت ایک بے داغ اور پاکیزہ عورت کو ستاتی رہتی تھی۔ اسے ذلیل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں اپنے اپنے آئیڈیل یا اقدار الگ الگ ہوتے ہیں۔ وہ بے حیا عورت پیسہ پانے میں جٹی ہوئی تھی۔ وہ آفس کے لوگ اور باس پر حکومت کر رہی تھی۔ اعلیٰ اخلاق کی حامل پونم چپ چاپ اپنے نہ کیے ہوئے جرموں کی سزا بھگت رہی تھی۔

یہ سب کب تک چلتا رہے گا؟ کیا پونم اس ناانصافی سے تھک کر ایک دن پتھر بن جائے گی؟ یا اپنے بنائے آدرش راستوں پر چلتی رہے گی؟ یہی سوال میرے من میں بار بار اُٹھتے تھے۔

وقت بیتتا گیا اور آج وہ آفس سے بڑے فخر کے ساتھ اپنے آدرش اور اُصولوں پر چلتے ہوئے ریٹائر ہوئی۔ تھوڑے دنوں کے بعد میں بھی آفس میں اونچا عہدہ حاصل کرنے کے بعد ریٹائر ہو جاؤں گا۔ میں اس کی خالی کرسی کی طرف دیکھنے لگا۔



فیصلہ

"شنو! تم بہت خوبصورت اور نازک مزاج ہو۔ تمہاری آواز بھی بہت میٹھی ہے" میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ پیدل چلتے وقت باتیں کرنے سے آواز ہانپنے لگ جاتی ہے۔

گھر کے پاس والے باغیچے میں مَیں روز شام کے وقت ٹہلنے جاتی ہوں۔ باغیچے کے ایک گیٹ سے دوسرے پھاٹک تک پندرہ منٹ لگتے ہیں۔ چھ چکر لگانے میں گھنٹہ لگ جاتا ہے۔ الگ الگ طرح کے لوگ بچے بوڑھے، عورت مرد، جوان، بیمار، اچھے سبھی اسی جگہ ملتے ہیں۔ جانے پہچانے چہرے اپنائیت سے بھرے ہوئے۔ برسوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے، مانو ایک ہی خاندان کے لوگ ہوں۔ اُصول کے پکے اپنے اپنے سے لگتے رہتے ہیں۔

شنو نے میرے سوال کا جواب ہلکی سی مسکان دیتے ہوئے کہا "میری عمر بڑھتی جارہی ہے۔ بڑے بڑے پوتے پوتیاں ہیں۔ تو بھی میں تمہیں خوبصورت اور سڈول لگتی ہوں۔ ایسے لگتا ہے شبنم، تمہاری آنکھوں میں ہی خوبصورتی بھری ہوئی ہے۔ نہ جانے کیوں تمہیں ہر چیز خوبصورت لگتی ہے۔ پتھر، مٹی، کانٹے، سوکھی ہوئی گھاس، مرجھائے پھول، پتوں کے بغیر پیڑ، بیمار، زخمی جانور پرندے سبھی چیزوں کو تم خوبصورت کہتی ہو۔ ایسی سبھی بدصورت چیزیں خوبصورت کیسے ہوئیں؟"

"ہاں! یہاں تو تم نے ٹھیک کہا شنو، مجھے ہر چیز، ہر دکھ میں بھی خوبصورتی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہر کڑوا میٹھا تجربہ بھی کوئی بہت ہی پیارا اور خوبصورت اثر چھوڑ جاتا ہے۔"

شنو، اس باغیچے میں ہم برسوں ملتی رہی ہیں۔ تم نے اپنی زندگی کے بارے میں بہت کچھ سنایا ہے اور سناتی رہتی ہو، آؤ، تھوڑا وقت بیٹھ کر آرام کر لیں"۔ ہم ایک بینچ پر بیٹھ گئیں۔

"شبنم، میں نے تمھیں اتنا تو بتایا تھا کہ میرے میکے والے متوسط طبقے کے تھے اور شادی بڑے سے بڑے گھر میں ہوئی، جن کی پورے شہر میں تعریف تھی۔

جب میری شادی کو چار سال گزرے اور کوئی اولاد نہیں ہوئی تو چاروں طرف کھسر پھسر ہونے لگی۔ وشال میری ساس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بیٹے کے بچے دیکھنا، اس کو پھلتے پھولتے دیکھنا یہ اس کی سب سے بڑی دلی آرزو تھی۔ دھیرے دھیرے روز گھر میں جھگڑا ہونے لگا اور اس کے بعد کوئی وجہ ملے یا نہ ملے سارا وقت جھگڑا، اولاد نہ ہونے کے مجھے طعنے ملنے لگے۔

جس بلڈنگ میں ہم رہتے تھے وہاں چھ فلیٹ تھے۔ جہاں میری ساس کی پانچ دیورانیاں اپنے اپنے فیملی کے ساتھ رہتی تھیں۔ دوسرے رشتے دار بھی وہاں رہتے تھے۔ اس لیے مہمانوں کی وہاں ہمیشہ بھیڑ سی لگی رہتی تھی۔

میرے بہت منتیں کرنے پر میرے پتی ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے راضی ہوگئے۔ ایک ڈاکٹر کی بات سننے کے بعد میرے پتی نے وہ رپورٹ نہ دِکھائی نہ سنائی۔ چار پانچ دوسرے ڈاکٹروں کے پاس بھی ہم گئے۔ آہستہ آہستہ وِشال کا غم گہراتا چلا گیا۔ میں بھی اپنی قوتِ برداشت کھوتی جارہی تھی۔ میں نے ایک دن ہمت کر کے پوچھ ہی لیا "وِشال کیا بات ہے؟ آخر ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟ اگر مجھ میں کچھ کمی ہو تو میں اپنا علاج کروانے کے لیے تیار ہوں اور تم میں......"۔ میں نے یہ جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ وِشال نے مایوس اور غمگین لہجے میں کہا "تم میں کوئی کمی نہیں ہے۔ آٹھ سال پہلے میرے ساتھ ایک بھیانک حادثہ ہوا تھا۔ میں اس حادثے سے بچ نکلا لیکن ڈاکٹر نے جو کچھ بھی بتایا اس سچ سے میں ناواقف تھا"۔

"ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟" شنو نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"میں باپ بننے کے لائق نہیں رہا اور کچھ سالوں کے بعد جسمانی تعلق کے لائق بھی نہیں رہوں گا۔ اب تم فیصلہ کرو کہ تم میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو یا نہیں......؟"

میرے جسم کا پورا خون سوکھ گیا۔ میں کانپ اُٹھی مانو کوئی گلا گھونٹ رہا تھا۔ سونی نظروں سے میں ان کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ بھی ایسی گھٹن برداشت نہیں کر سکے اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ دو چار دنوں تک ضروری بات چیت بھی ہم آپس میں نہیں کر سکے۔

ایک دن وہ شام کے وقت گھر جلدی لوٹ آئے اور کہنے لگے، چلو کہیں گھوم آئیں۔ اس سے تمہارا من بہل جائے گا۔ بہت دنوں کے بعد میں نے انھیں ہلکے پھلکے موڈ میں دیکھا تھا۔ میں جلدی جلدی تیار ہو کر ان کے ساتھ نکل پڑی۔ دل پر جو بوجھ سا تھا وہ ہلکا ہو گیا۔

وشال شہر سے باہر مجھے ایک لمبی سی ڈرائیو پر لے گیا۔ ایک تالاب کے نزدیک پیڑوں کی جھرمٹ میں اس نے کار کو کھڑا کر دیا۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی اور حیرانی بھی...... آخر وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس نے پیار سے آہستہ آہستہ میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھ میں تھام لیا اور کہا "شنو! جو باتیں میں تم سے کہنے جا رہا ہوں وہ دھیان سے سنو۔ تمہاری اور میری بے انتہا محبت کی ایک مانگ ہے اور وہ ہے، ایک ننھے سے بچے کا گھر میں ہونا۔ ہم دونوں کے بیچ ایک پل۔ کچھ دن سوچنے کے بعد جو میں نے طے کیا ہے تمہارے لیے اسے سننا یا اس کو قبول کرنا بہت ہی دکھ پہنچانے والا ہو گا لیکن اس فیصلہ پر چلنا ہم دونوں کے لیے انتہائی ضروری ہے۔"

میں اس کی باتیں غور سے سنتی رہی۔ کیا کہوں؟ کیا پوچھوں؟ کیا سوچوں؟ پیڑوں کی آڑ میں وشال کی گود میں سر رکھ کر میں پر سکون ہو کر لیٹ گئی۔ تھوڑی سی مسرت، تھوڑا سا آرام اور وشال کے سہارے کا احساس مجھے ہو رہا تھا۔ اس کی میٹھی گود میں سکون اور ہمت و صبر ملنے لگا۔ میں نے ہمت کو پکڑے رکھا، وہ بات سننے کے لیے جو وہ سنانا چاہ رہا تھا۔

وشال نے میرے ماتھے پر ایک ہلکا سا بوسہ دیا اور میرے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگا "آنند میرا بہت ہی اچھا دوست ہے۔ بہت گہرا دوست اور ہمراز ہے۔ تم اسے تھوڑا سا جانتی ہو۔ وہ میرا سب سے قریبی دوست ہے۔ جس سے میں من کی سبھی باتیں کہتا ہوں۔ اس سے میں نے اپنے دل کی باتیں بول دی ہیں۔ ڈاکٹر والی بات بھی میں نے پوری کی پوری اسے سنائی ہے"۔ وشال نے ایک لمبی ٹھنڈی سی آہ بھری۔

آہستہ آہستہ نہ جانے وہ کون سی گرہیں کھولنے جا رہا تھا۔ نہ جانے اب وہ کیا کہے گا؟ نہ جانے کون سی بجلی اب مجھ پر گرے گی؟ میں سانس روکے خاموشی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

اس نے کہا "شنو، سنو میں نے ایک راستہ نکالا ہے، نئے مہمان کو لانے کا! تمہارے اور

میرے نہ بچھڑنے کا! خاندان کے سلسلے کو ہمیشہ کے لیے قائم رکھنے کا! بڑی بوڑھیوں کے آنکھوں کا ایک خواب، ان کی اُمنگوں آرزوؤں اور ارادوں کو قائم رکھنے کا۔ تمہارے میرے بیچ ایک خلا بھرنے کا"

میں نے پوری طاقت لگا کر پوچھا"کون سا راستہ وشال؟"

"تمہارے اور آنند کے بیچ جسمانی تعلق۔ شاستروں میں پہلے زمانے میں اسے "نیوگ وِدھی" کہا جاتا تھا۔ اپنی نسل کو آگے بڑھانے کے لیے راجہ مہاراجہ اسی نیوگ وِدھی کا استعمال کرتے تھے۔ میں بھی اِس وِدھی کو مناسب مانتا ہوں۔ آنند ابھی تک کنوارا ہے"۔

جیسے ایک بم سا پھٹا۔ بارود ہی بارود میری آنکھوں کے سامنے چھا گئی۔ کانوں میں جیسے سیٹیاں بجنے لگیں۔ میں زور زور سے رونے لگی۔ ماحول سے بالکل بے خبر میرا دل پھٹنے لگا۔ وقت کا کوئی احساس نہیں رہا۔ نہ جانے کب میں رو رو کر تھک گئی۔ نیم بیہوشی کی سی حالت میں نہ جانے کب اور کیسے وِشال کار میں مجھے ڈال کر آنند کے بنگلے تک لے گیا۔ ہوش میں آنے پر میں نے اپنے آپ کو آنند کے اجنبی کمرے میں پلنگ پر پڑے ہوئے پایا! جسم صرف چادر سے ڈھکا ہوا......!"

باغیچے میں پیڑوں پر بیٹھے پرندوں کی چہچہاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ شنو کی آواز ڈوبتی سی معلوم ہوئی۔ میں نے اسے تھوڑا ہلایا، "شنو، اٹھو گھر چلیں۔ دیر ہو رہی ہے چلو" میں نے کانپتی ہوئی شنو کو اپنی دونوں بانہوں کا سہارا دیتے ہوئے اٹھایا، اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ اس کی آنکھیں دھندلی سی تھیں۔

"اچھا، شنو کل باغیچے میں پھر ملیں گے" وہ بائیں طرف اپنی سنی پر چڑھ کر گھر روانہ ہو گئی اور میں دائیں طرف گھر کے لیے چل پڑی۔

وہ دو تین دنوں تک باغیچے میں مجھے نہیں ملی۔ میں اپنے روزانہ کے معمول کے مطابق روزانہ ٹہلنے جاتی تھی۔ میری آنکھیں شنو کو ڈھونڈتی تھیں۔ ایک شام وہ مجھے دِکھائی دی۔ وہ اپنے پسندیدہ گول گول والے راستے پر ٹہل رہی تھی۔ نیلے رنگ کی شلوار اور قمیص میں وہ بہت ہی خوبصورت دِکھ رہی تھی۔ چار دن نہ ملنے کی وجہ آج ہم ایک دوسرے کو دیکھتے ہی زور زور سے ہنس پڑیں۔ دونوں گلے ملیں اور ساتھ ساتھ ٹہلتی رہیں۔ میں نے بات چیت کا سلسلہ شروع کیا

"شنو، باغیچے میں اتنے پکے راستے ہیں اور تم اس کچے راستے پر کیوں چلتی رہتی ہو؟"

ایسا لگتا ہے، سیدھے راستے میرے لیے بنے ہی نہیں۔ مجھے نہ جانے کیوں سیدھے راستے بہت مشکل لگتے ہیں۔ آج میرا موڈ ٹھیک نہیں ہے" شنو نے کہا۔

میں نے پوچھا" کیا ہوا تمہارے موڈ کو؟"

"آج بہو بیٹے سے ہوئے جھگڑے، ان کا میرے ساتھ سلوک یاد آرہا ہے۔ میرے بیٹے نے میری بہت توہین کی تھی۔ اس نے میری ممتا کا ذرا بھی خیال نہیں کیا۔ میرے زخمی دل پر مرہم رکھنے کے بجائے وہ زخم دیے جو ناسور بن گئے ہیں اب۔ خود وِشال تو سدھار چکے، مجھے چھوڑ گئے اس جہنم میں۔

میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا" وِشال کا انتقال ہو چکا؟ کب؟ کیسے؟ تم نے تو یہ بات مجھے بتائی نہیں۔"

"ہاں، اس رات آنند کے گھر سے لوٹنے کے بعد میرا پاؤں بھاری ہو گیا تھا۔ ایک لڑکے کا جنم ہوا جس کے پیدا ہوتے ہی چاروں طرف سے مجھے مبارکبادیاں ملنے لگیں۔ خوشیاں آئیں۔ پانچ سال ہماری زندگی کے سب سے اچھے خوشحال اور خوبصورت بیت گئے لیکن......" کہتے کہتے اس کی آواز کانپنے لگی۔

"لیکن کیا؟......" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اس دن میرے بیٹے کی پانچویں سالگرہ تھی۔ آنند کو بھی مدعو کیا تھا۔ اسے خاص وجہ سے بلایا تھا۔ ہاں، تمھیں بتانا بھول گئی کہ اس رات کے حادثے کے بعد آنند بنگلور چلا گیا تھا۔ ہم سے مل کر بھی نہیں گیا تھا۔ اب وہ ہمیشہ کے لیے امریکہ جانے والا تھا۔ سارا گھر سجایا گیا تھا۔ بچے، جوان، بوڑھے، بہت سارے لوگ گھر میں آئے ہوئے تھے۔ ماحول میں شہنائی کی آواز گونج رہی تھی۔ ہنسی مذاق اچھا لگ رہا تھا۔ آنند نے بہلو کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔ اسے گلے سے لگایا۔ اس کے گالوں پر بوسوں کی بارش کر دی۔ بہت ہی بڑھیا تحفہ دیا۔ اسے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ وہ اسے چھوڑ ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہنے لگے تھے"۔

اسی رات وِشال نے خودکشی کر لی تھی!" سناٹا...... ایک گہرا سناٹا چھا گیا سارے ماحول پر۔

ایک پل کے لیے جیسے میری سانس رُک گئی۔ شنو نے اتنا کہہ کر اپنی آنکھیں موند لیں۔ بینچ پر سر رکھ کر پتھر کی مورتی کی طرح وہ بیٹھی رہی۔ مجھ میں تو ایک لفظ بھی کہنے کی طاقت نہیں تھی۔ اتنے بڑے حادثے کی بات سن کر میں کیا کہتی؟ مجھے تو لفظ بھی نہیں مل رہے تھے۔

باغیچے میں گنیش کا ایک مندر ہے، وہاں آرتی ہو رہی تھی۔ مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ بیخودی میں میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑا، اسے سہارا دیا اور مندر میں لے گئی۔ مندر میں گنیش کی آرتی "سکھ کرتا...... دکھ کرتا" ہو رہی تھی۔ اگر بتی کی خوشبو، آرتی کی لے پر تالیوں کی آواز، بھگوان گنیش کی مورتی، عقیدت اور بھروسے کے احساس سے میری نس نس میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ دیے کی مدھم روشنی میں میں نے دیکھا کہ شنو کا بجھا ہوا چہرہ بھی دھیرے دھیرے شانت ہونے لگا۔ آرتی ختم ہو گئی تھی۔ شنو نے کہا "شبنم، میں آج سنی نہیں لائی۔ مجھے تم گھر تک چھوڑ دو گی؟" میں نے گردن ہلا کر ہاں کہہ دی۔

پیدل چلتے چلتے شنو نے کہنا شروع کر دیا "اور شادی کے نو دس سالوں کے اندر میں بیوہ ہو گئی۔ میں نے وشال کے فیصلے کو قبول کیا لیکن وہ اپنے ہی فیصلے کو دل سے قبول نہیں کر سکا۔ اپنا فیصلہ مجھ پر اور آنند پر تھوپ کر وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے مجھ موڑ کر چلا گیا۔ بزدل کہیں کا...... یہ بھی نہیں سوچا کہ پہاڑ جیسی زندگی میں کیسے کاٹوں گی۔ اس کی خودکشی نے مجھے توڑ دیا۔"

میرا بیٹا ساگر بچپن سے ہی ضدی، جذباتی، جلدی غصہ ہونے والے مزاج کا تھا۔ شادی ہونے کے بعد وہ اور اس کی پتنی مجھ سے بالکل ہی نہیں نباہ پائے۔ میری بہت منتیں کرنے کے بعد بھی دونوں الگ الگ گھر میں رہے۔ میں اس کے لیے ایسے تڑپنے لگی جیسے پانی بغیر مچھلی۔ میں نے انھیں بہت سمجھا بجھایا۔ لیکن وہ دونوں مجھے تڑپتا چھوڑ کر چلے گئے۔ میری جیسے ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ گھر چھوڑتے وقت ساگر نے میری ڈائری میرے سامنے پھینک دی جس میں اس کی پیدائش کا واقعہ لکھا ہوا تھا۔ نہ جانے کون سے غلط پل میں میری ڈائری اس کے ہاتھ لگ گئی تھی۔

اس نے چلا کر کہا "تم بے حیا ہو۔ اپنے آپ کو ستی ساوتری مت کہلاؤ، تم ہر جائی ہو!!!"

"شبنم، میں نے بچپن سے ہی بابُو جی اور ماں کے کیے ہوئے سارے فیصلے قبول کیے تھے۔ لباس، کھانا پینا، تعلیم، شادی سبھی فیصلے دوسروں کے کیے ہوئے تھے۔ اپنی چاہت، پسند، اپنی

شخصیت کے بارے میں مَیں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ شادی کے بعد وشال کا ہر فیصلہ میں نے اس کی خوشی کی خاطر اپنے سر آنکھوں پر رکھا اور آج میرا اپنا خون، اپنا ہی بیٹا ایسا فیصلہ سنا کر چلا گیا۔ کیا زندگی کی عدالت میں مَیں گنہگار ہوں؟ مجھے دوسروں کی سننے کی عادت پڑی ہے۔ میں کیا چاہتی ہوں؟ کیا چاہیے؟ کبھی اس کے بارے میں نہیں سوچا۔ میں اتنی کمزور کیوں ہوں شبنم؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس کا گھر آچکا تھا۔ میں نے اس کو گھر کے باہر چھوڑا اور بھاری من سے اپنے گھر لوٹی۔ کھانا وغیرہ پکایا، کام کاج پورا کر کے بچوں اور پتی کے ساتھ ٹی وی دیکھنے بیٹھ گئی۔ اس کے بعد کچھ لکھنے پڑھنے بیٹھی تو جی کچھ ہلکا ہوا۔ کچھ دن ذاتی مصروفیات میں گزرے۔ ٹہلنے کے روزانہ معمول میں رکاوٹ آگئی تھی۔

ایک دن یوگا کلاس سے واپس لوٹی تو کام والی نے پیغام دیا "شنو دیدی کا فون آیا تھا۔ آپ کو گھر پر بلایا ہے"۔ میں نے جلدی جلدی دوپٹہ اوڑھا، چپل پہنی اور بائی کو کھانا پکانے کے لیے کہا اور گھر والوں کے لیے پیغام رکھا "سہیلی کے پاس جارہی ہوں۔ دیر ہو جانے پر فکر مت کرنا" شنو کا فون نمبر بھی لکھ دیا تھا۔

شنو کے گھر پہنچی۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ "کیا ہوا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ گھر میں کوئی نہیں ہے کیا؟" میں نے ایک ہی سانس میں تین چار سوالات پوچھ ڈالے۔ "شبنم، میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ ذرا بیٹھو تو، پہلے تمھیں پانی لا دیتی ہوں!" وہ پانی لائی اور پوچھا "چائے پیو گی؟" میں نے منع کر دیا۔ وہ مجھے ایک چھوٹی بچی جیسی لگی۔ اسے میں تھپکیاں دینے لگیں۔

"شبنم، تمہاری پیار بھری اپنائیت، ہمدردی اور اعتماد پا کر میرے من کے زخم پھر سے کھل گئے ہیں۔ ماضی کی کڑوی یادیں بہت تیکھی ہوتی جارہی ہیں۔ میں اپنی ہر بات تمھیں سناتی ہوں۔ تم سے کچھ بھی چھپانے کو من نہیں کرتا"۔ اتنا کہہ کر اس نے میرے ہاتھ میں ایک چٹھی دی اور کہا "پڑھو!"

میں نے جلد بازی سے پوچھا "کس کا خط ہے؟"

"اتنے برسوں کے بعد یہ آنند کا مجھے پہلی بار لکھا ہوا خط ہے جو امریکہ سے آیا ہے"۔

میں خط پڑھنے لگی "شنو! اس رات کے بعد میں نے اپنے آپ کو اتنا گرا ہوا پایا کہ میں شادی بھی نہ کر سکا۔ ایک پل کی کمزوری نے میرے ضمیر کو اس قدر پھٹکارا کہ پھر کبھی مرتے دم تک تمہارے سامنے نہ آنے کی قسم کھائی تھی میں نے۔ ساگر کی سالگرہ پر اپنا عہد توڑ کر آیا تھا۔ وہاں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور اس بچے کو جی بھر کر پیار کیا۔ میرے برتاؤ سے وشال کے دل کو نہ جانے کیا ٹھیس پہنچی کہ اس نے خودکشی کر لی! میں اپنے آپ کو تمہارا گنہگار مانتا ہوں۔ "شنو، یہ خط دیکھ کر تم حیرت میں پڑ گئی ہو گی۔ بات یہ ہے کہ تمہارے پڑوس میں رہنے والی ایک فیملی یہاں امریکہ میں میرے پڑوس میں رہنے کے لیے آئی ہوئی ہے۔ خبروں کے تبادلے کے بعد پتہ چلا کہ وہ تم لوگوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ جس اولاد کے لیے تم نے اتنے دکھ برداشت کیے وہی اب تمھیں اکیلا چھوڑ کر الگ رہنے چلا گیا ہے اور وہ بھی ایسی حالت میں جب تمھیں خدمت اور سہارے کی ضرورت ہے۔ شنو، تم ہر طرح سے اب اکیلی پڑ گئی ہو۔ میں نے بھی اب تک اکیلے زندگی گزاری ہے۔ نہ جانے اب زندگی کے کتنے دن بچے ہیں؟ کیا تم بچے ہوئے زندگی کے پل میرے ساتھ بانٹنا چاہو گی؟ میرے اکیلے پن میں شریک ہو گی؟ کیا تم یہاں آکر میرے ساتھ رہو گی؟ کیا تم مجھے ایک موقع دے سکو گی؟ مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔"

خط ختم ہوا۔ اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ بدلے میں میں نے سامنے دیوار پر ٹنگی گھڑی کی طرف دیکھا۔ بہت وقت بیت گیا تھا۔ میں نے اس کے بالوں میں اپنی اُنگلیاں پھیریں اور دھیرے دھیرے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "شنو، مجھے بہت دیر ہو رہی ہے۔ اب کی بار اپنی زندگی کا فیصلہ پہلی بار تم خود کرو گی۔ تمہاری انتر آتما تمھیں ہدایت دے گی۔ تمھیں صحیح راستہ دکھائے گی۔ اس بات پر مجھے پورا یقین ہے۔"

وہ زور زور سے رونے لگی۔ میں نے اس کی پیشانی پر ہلکا سا بوسہ دیا اور وہاں سے چلی آئی۔ میرے چہرے پر مونالیزا والی راز بھری مسکان چھا گئی تھی۔



قدرت کا قانون

وہ ہر روز صبح سویرے اور شام کے وقت ٹہلنے نکلتی تھی۔ صبح کے سحر انگیز ماحول میں پرندوں کی میٹھی آوازیں، شبنم کی بوندوں سے نہائے ہوئے پودھے، پھول، پتیاں، ٹہنیاں، ہلکا ہلکا کہر اور سکون اسے بھگوان کے ہمیشہ قریب ہونے کا احساس دلاتے تھے۔ بلاناغہ پیدل چلنے کے راستے پر کچھ پلوں کے لیے اس کے بڑھتے قدم ایک پرسکون اور خاموش بنگلے کے آگے رک جاتے تھے۔ کیا تھا اس گھر میں؟ جس کی انوکھی جاذبیت کو وہ روز ہی محسوس کرتی تھی۔ اس گھر کے برآمدے کی دیواریں میانہ قد تھیں اور گیٹ کی سلاخوں میں بہت فرق تھا۔ جہاں سے اندر کا منظر دِکھائی دیتا تھا۔

اس بنگلے سے گزرتے ہوئے اسے کبھی ستار، کبھی وینا، کبھی بانسری کی آواز اور کبھی بھجن کی پیاری آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کبھی کبھی ایک بوڑھا جوڑا سفید کپڑے پہنے ہوئے ہنسوں کے جوڑی کی طرح ساتھ میں تو کبھی اکیلے نظر آتے تھے۔ کبھی مرد اخبار پڑھتا تھا تو کبھی وہ بوڑھی عورت پھول چنتی نظر آتی تھی۔ کبھی مرد پودوں کو پانی دیتا رہتا تھا تو آنگن کے کسی ایک چھوٹے سے کونے میں وہ عورت آنکھیں موندے سادھی میں مصروف دکھائی دیتی تھی۔ کبھی پتنی تلسی کے باغ میں سرشار دِکھائی دیتی تھی تو وہ موسیقی کی تال پر گردن ہلاتا نظر آتا تھا۔ اور کبھی دونوں مل کر چائے کی چسکیوں میں مست رہتے تھے۔ کچھ پلوں کے لیے اس گھر میں گزرتے ہوئے پرسکون، بھری پری زندگی اور پاک ماحول کے سکھ کی لالچ اور اپنے گھر میں بھی وہی خوشی بھرنے کی کوشش میں وہ روز وہیں سے گزرتی تھی اور ایک تازگی لے کر آتی تھی۔

ایک دن صبح سویرے کی پر سکون فضا میں اس بنگلے سے بہت شور شرابے کی آوازیں آنے لگیں۔ کچھ مزدور تھے۔ بلڈوزر راکشش کی طرح اس گھر کی ہری مخملی گھاس پر گھوم رہا تھا۔ وہ اس صبح کو اُس بوڑھے جوڑے کو دیکھ نہ پائی۔ دیکھتے دیکھتے ہر صبح تتر بتر ہونے لگی۔ تلسی کا پاک باغیچہ تھا نہ مندر، نہ پھول، نہ پودے، نہ ستار کا سر اور نہ میٹھے گیت۔ اب وہاں شور بھرے انگریزی گانوں کی آواز سنائی دیتی تھیں جو اس کو اور اس کی روح کو اداسی سے بھر دیتی تھیں۔ کچھ مہینوں کے بعد جانکی نے اس پھاٹک کے دروازے کو کھلا ہوا دیکھا۔ وہ شام کا وقت تھا۔ ایک چوکیدار یونیفارم میں ملبوس وہاں کھڑا تھا۔ اندر کوئی پارٹی چل رہی تھی۔ زور زور سے موسیقی کی آوازیں آرہی تھیں۔ بوتلوں اور پیالوں کے کھنکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ شاید وہ شراب پی رہے تھے۔ وہ نہ جانے کیوں مشینی انداز میں کھڑی ہو گئی۔ برسوں سے بنی ہوئی اس گھر کی پُر سکون اور پاک تصویر بکھر رہی تھی۔ اس کو یہ ساری باتیں چھلنی چھلنی کر رہی تھیں۔ اِدھر اُدھر دیکھ کے جب اسے بھروسہ ہوا کہ چوکیدار کے آس پاس اور کوئی شخص نہیں ہے تو وہ چوکیدار کے پاس آئی اور ہچکچاتے ہوئے پوچھنے لگی "پہلے والے مالک کہاں گئے؟ یہ کون لوگ ہیں جو یہاں رہنے آئے ہیں؟"

"وہ دونوں ایک چھوٹے سے گاؤں میں سماج سیوا کرنے چلے گئے ہیں۔ دونوں پتی پتنی ڈاکٹر ہیں۔ انھیں لگا کہ بھارت کے گاؤں اُنھیں بلا رہے ہیں۔ وہاں ان کی بہت ضرورت ہے۔ اس لیے وہ چلے گئے۔ ایک گاؤں کو بسانے کے لیے۔ یہاں ان کا بیٹا اور بہو جو بدلیس میں رہتے تھے، رہنے آگئے ہیں"۔

وقت بدلتا رہا۔ اس کے پیدل چلنے کی عادت نہیں بدلی۔ کانپتی ہوئی ٹانگوں اور بڑھتی ہوئی عمر کا سہارا ایک لکڑی لے کر وہ اس کے سہارے پیدل ٹہلنے نکلتی تھی۔

دیوالی بہت دور تھی پھر بھی جانکی کو تیاری کی فکر ستانے لگی۔ اس نے نوکر کو اوپر سے ایک وزنی صندوق نکالنے کو کہا۔ اس صندوق میں اس کے ہاتھوں سے بنی ہوئی قیمتی چادریں، تکیوں کے کور، ٹیبل کور اور پردے تھے۔ جو اس نے آنکھوں کو بہت تکلیف دے دے کر بہت ہی چاؤ سے بنائے ہوئے تھے۔ دو تین تو شوق تھے اس کے، کتابیں پڑھنا، لکھنا، کڑائی بُنائی، تصویر کشی، تصویریں اکٹھے کرنا، موسیقی، ناچ اور قدرتی مناظر دیکھنا۔

جانکی کا بیٹا راکیش اپنے ننھے منے بچے کی اُنگلی پکڑ کر ماں کے پاس آیا، "ممی، اس دیوالی پر پورے گھر کو رنگ لگوانا ہے اور تھوڑا بہت اول بدل کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ گھر کے فرنیچر بھی بدل دوں گا۔ ممی، تمہیں رنگ اور دھول کی ایلرجی ہے۔ تمہاری طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔ اس لیے مہینہ بھر میں تمہیں خالہ کے پاس چھوڑ آتا ہوں۔ کہیں تم اس شور شرابے والے ماحول اور رنگ کی بدبو سے بیمار نہ پڑ جاؤ"۔ دو تین دنوں کے بعد ہی وہ اپنی بہن کے گھر جو ناسک میں رہتی تھی، وہاں کے لیے روانہ ہو گئی۔

لکشمی پوجا کے دو تین دن پہلے راکیش اپنی ماں جانکی کو گھر لے آیا۔ جانکی اپنے گھر کے پھاٹک سے برآمدے تک اور برآمدے سے اپنے گھر کے دروازے تک کچھ بھی پہچاننے میں ناکام رہی۔ اس نے آس پاس والے گھر کو اور پڑوسیوں کو دیکھ کر پہچانا کہ یہ اسی کا گھر ہے۔ اس کو تھوڑا اطمینان ہوا لیکن جیسے ہی وہ اپنے گھر میں داخل ہوئی اس کا دماغ چکرانے لگا۔ باغیچے، قالین، پردے، گھر کے فرنیچر سب بدلے ہوئے تھے۔ ان سب میں اس کی اپنی کوئی بھی پسند شامل نہیں تھی۔ اسے ساری چیزیں اجنبی اجنبی سی لگنے لگیں۔ گھر میں داخل ہونے پر اس نے دیکھا کہ مختلف قسم کی مورتیاں جو اس نے بھارت اور غیر ممالک سے اکٹھی کی تھیں وہ کہیں بھی نظر نہیں آئیں۔ اس کی تلسی، اس کا مندر، اس کے دیوتا، پوجا کے سامان، کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں، برسوں جمع کیے ہوئے کیسٹ، بہت ساری سندھی کیسٹ جو اس نے سندھ سے نہ جانے کس کس کو منتیں کر کے منگوائی تھیں، اپنی سانسوں سے بھی بڑھ کر کچھ تحفے، یادوں سے لپٹی ہوئی اپنے بزرگوں کی آشیر واد میں دی ہوئی کچھ چیزیں، ان کی بڑی بڑی تصویریں، ان ساری چیزوں سے اسے انتہائی پیار تھا۔ اس میں ہی اس کے وجود اور اس کی شخصیت دکھائی دیتی تھی۔ وہ ساری چیزیں اس گھر میں کہیں بھی نہیں تھیں۔ اس نے اپنے بیٹے راکیش سے پوچھا "میری ساری چیزیں، میرا سارا سامان کہاں گیا؟" اس نے پرسکون اور ٹھنڈے لہجے میں اور چہرے پر بغیر کوئی رنگ لائے کہا "ساری چیزیں بہت پرانی ہو گئی تھیں اور ان بے کار سی چیزوں سے سارا گھر بھرا بھرا سا لگتا تھا۔ کباڑی کے ہاتھوں بیچ دیں۔ گھر بھی تو چھوٹا ہے ماں! میرے سارے دوست مجھ پر ہنستے تھے۔ میرا مذاق اڑاتے تھے۔ یہ جدید زمانہ ہے ماں! جس میں سب کچھ جدید ہونا بہت ضروری ہے۔"

جانکی نے اسے کچھ بھی نہ کہا۔ کچھ بھی تو میرا اپنا پہچانا ہوا نہیں ہے کہ وہ گھر مجھے اپنا لگے۔ جانکی کو سبھی چیزیں اور سب کچھ اجنبی سا لگنے لگا۔ اپنا گھر بھی!

اس کا بیٹا اسے ایک کمرے میں لے آیا اور بہت ہی شان سے کہنے لگا "ممی، یہ تمہارا کمرہ ہے۔ میں نے تمھیں وہی تمہارا کمرہ دیا ہے۔ دیکھو تو کتنا خوبصورت بن گیا ہے۔ کہاں وہ تمہارا پرانا، گندا، بھدا سا کمرہ۔ اس میں سب جدید سہولتیں ہیں۔ دیکھا ممی، پیسہ پھینک تماشہ دیکھ"۔ جانکی کے پیروں نے جیسے ہی بہت قیمتی اور مہنگے قالین کو چھوا تو وہ لرز اُٹھی۔ اپنے جذبات کو سنبھال کر اپنے آپ کو سمیٹ کر اندر آکر وہ ایک نئے صوفہ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اپنی سانسوں سے بھی زیادہ محبوب جن چیزوں کو وہ پیار کرتی تھی وہ اسے کہیں دِکھائی نہیں دیں، اس کا ستار، گھنگھرو، لکھنے کی ٹیبل، ہاتھوں سے بنائی ہوئی تصاویر کچھ بھی تو نہیں تھا وہاں۔

اس کمرے میں کوئی بھی ایسا کونہ نہیں تھا جو اسے اپنا اور پیارا لگے۔ کچھ بھی جانا پہچانا نہیں۔ مرجھائے ہوئے دل سے اپنی رلائی کو روک کر ویران آنکھوں سے وہ ایک بہت بڑے عالیشان پلنگ پر آ بیٹھی۔ لیکن اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں بہت مہنگے کمرے میں کچھ پلوں کے لیے بیٹھی ہے۔ اپنے گھر میں نہیں۔ وہ ہر چیز کو چھو کر پہچان پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ چھوٹا سا ٹی وی، ویڈیو سیٹ، چھوٹا سا فریج...... وہ سب سے "ہیلو ہیلو" کہہ کر اپنے آپ کو ان سے متعارف کرانے لگی۔ اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ اس کا دل جیسے مر گیا تھا۔ بے جان سی وہاں بیٹھی ہوئی تھی وہ۔

اچانک اسے یاد آیا آنگن میں ایک وِشال پیپل کا درخت جب وہ ناسک جا رہی تھی تب وہ پیلے پتوں سے بھرا ہوا تھا۔ پیپل تھکا ہوا، بوڑھا، مرجھایا ہوا تھا۔ کیا ہوا اس کا؟ کہیں اس کو بھی راکیش نے...... اس کا پورا جسم کانپنے لگا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر دیکھا تو اس کے چہرے پر مسکان چھا گئی۔ پیپل ہرے بھرے پتوں سے بھرا ہوا تھا۔ جھوم رہا تھا۔ لہرا رہا تھا۔ اس درخت نے، اس کے نئے پتوں نے جھوم جھوم کر اس کا استقبال کیا۔ پتے کھڑک کھڑک کر تالیاں بجانے لگے۔ اس مدھر پاک موسیقی سے اس کا تن من جھومنے لگا۔ روحانی خوشی، جوش اور محبت سے وہ سراپا سرشار ہو گئی۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی۔ قدرت کا یہی تو قانون ہے۔ جب پیلے پتے

جھڑیں گے تبھی تو کچھ نیا بنے گا۔ خوبصورت ہرے پتے نئے جوش اور اُمنگ سے بھری بوڑھی ڈالیوں پر اور درخت کے بوڑھے تنے پر لدے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی بہو اور بیٹے کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا، انھیں دعائیں دیں اور نئے نرم بستر پر لیٹ گئی۔ اسے یاد آنے لگے وہ بوڑھا جوڑا جو اپنا گھر بیٹے کو دے کر گاؤں چلا گیا تھا۔ اسے گہری نیند آنے لگی۔ وہ روحانی سکھ اور اطمینان سے بھر گئی۔ جانکی کا چہرہ نورانی ہو اُٹھا۔ اس کے چہرے پر بہت پیاری سی مسکان تھی۔ پیپل کے درخت جیسی......!



رشتے

میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ کیا پڑھ رہی تھی، مجھے کچھ بھی ہوش نہیں تھا۔ عجیب حالت تھی دل کی۔ ہونٹ سوکھ رہے تھے۔ آنکھیں اسے دیکھتی جارہی تھیں۔ غضب کا لوچ تھا اس کی آواز میں۔ اس کی مسکان میں ایک جادو سا تھا۔ مشاعرے میں سندھیا شامل ہورہی ہے پتہ لگتے ہی میں جاکر سامعین میں شامل ہو جاتا۔ سندھیا سے گفتگو کرنا میرے لیے بہت مشکل کام تھا۔ وہ غزل پڑھنے کے بعد اپنے آپ میں کھو جاتی تھی۔ آس پاس کے ماحول سے بالکل ہی بے خبر ہو جاتی تھی۔ جب سب لوگ اس کی خوبصورتی اور ہنر کی تعریف کرتے تو اس کی آنکھیں نہ جانے کہاں کھوئی رہتیں۔ اس کے چہرے پر دل موہنے والی مسکان رہتی تھی۔ اتنی تعریف اور داد ملنے کے بعد بھی اس کی مدھر اور سوندھی میٹھی مسکان میں اپنائیت بھری ہوئی رہتی تھی۔

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد سبھی اپنی باتوں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ کچھ اس کی تعریف میں چار چاند لگاتے تو کوئی نکتہ چینی بھی کرتا۔ او! ہو! وہ تو میری طرف ہی آرہی ہے۔ میرے دل کی دھڑکنیں بڑھنے لگیں۔ سندھیا نے نمستے کیا اور کہا "مبارک ہو آپ کو!" میں حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا "انعام پانے کے لیے مبارکباد دے رہی ہوں۔ آپ کی رباعیوں کی کتاب کو انعام دے کر اعزاز جو دیا گیا ہے۔ میں نے پڑھی تو نہیں ہے لیکن تعریف سنی ہے"۔ اس نے باتوں کا سلسلہ بڑھاتے ہوئے کہا "مسٹر دیپک! میں نے آپ کی لکھی ہوئی لگ بھگ ساری کتابیں پڑھیں لیکن آپ وہ رباعیوں کی نئی کتاب ضرور دیجئے گا"۔ میں نے آنکھیں جھکا کر شکریہ ادا کیا۔ اس نے پوچھا "آپ شاید شرمیلے ہیں یا تنہائی پسند کرنے والے؟ ہمیشہ کسی کونے میں خاموش بیٹھے رہتے ہیں؛ یا سوچتے رہتے ہیں؟ کتنے ایوارڈ ملے ہیں آپ کو؟" نہ جانے کیوں میں اس کے کسی بھی سوال کا

جواب نہیں دے پا رہا تھا۔ گلے میں جیسے کچھ اٹک سا گیا تھا۔ اتنا کہہ کر وہ آگے چل پڑی۔ اس کا یوں اپنائیت سے باتیں کرنا مجھے اچھا لگا تھا۔

میں اپنے آپ کو بہت ہی خوش نصیب سمجھنے لگا۔ میرے یار دوست جلن اور حسرت سے بھر کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میرا سوچنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ بھی میری طرف اتنی توجہ دیتی ہو گی؟ اتنا میرے بارے میں سوچتی ہو گی؟ اس لیے تو اس طرح مجھ سے بات چیت کی جیسے صدیوں سے مجھے جانتی ہے۔ میرا تن من جھوم اُٹھا۔

چھ مہینے کے بعد ایک مشاعرہ تھا جس میں وہ بھی حصہ لینے والی تھی اور میں بھی۔ میں آج بہت ہی سج دھج کر جا رہا تھا۔ نہرو کرتا پائجامہ، جیکٹ، شاعروں جیسی ایک قیمتی شال بھی اپنے کندھوں پر لٹکالی۔ گھر والی سے چھپ کر زندگی میں پہلی بار پاؤڈر بھی چہرے پر لگایا۔ میں اپنے آپ کو اچھا لگنے لگا۔ اپنی لکھی ہوئی رباعیوں کی کتاب پر ایک خوبصورت کور لگایا۔ اس کے اندر ایک گلاب کا پھول بھی رکھا۔ شام کو یہ کتاب کیسے دوں گا، اس کی ریہرسل بھی آئینے کے سامنے دو تین بار کی۔ چہرے پر ایسے ہاؤ بھاؤ بنائے کہ میں بہت خوبصورت دِکھائی دوں۔

شہ نشین پر جیسے سندھیا ہی سندھیا چھا گئی تھی۔ آج وہ ایک عشقیہ غزل ترنم میں گنگنا رہی تھی۔ غزل کا عنوان تھا "بارش"۔ اس کے پڑھنے کے انداز پر لوگ نچھاور ہو رہے تھے۔ واہ! واہ! کی بارش ہو رہی تھی۔ اس نے گلابی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس کے گال، چہرہ، ہونٹ اور لباس سبھی گلابی رنگ سا لگ رہا تھا۔ وہ خود ایک گلاب کا پھول دِکھائی دے رہی تھی۔ پسینے کی ہلکی بوندیں شبنمی قطروں کی طرح اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہی تھیں۔ میں ہمیشہ کی طرح ایک ہلکی پھلکی غزل سنا کر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے تو اچھے انداز سے پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔

جیسے ہی مشاعرہ ختم ہوا میں جلدی جلدی بھیڑ سے راستہ چیر کر اسٹیج کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ یہاں سے ضرور گزرے گی۔ میرا اندازہ صحیح نکلا، وہ اس طرف ہی آ رہی تھی۔ میں نے ہمت کر کے اسے 'ہیلو' کہا اور کتاب ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا 'چلیے، کہیں چل کر چائے پیتے ہیں"۔

سندھیا تھوڑی پریشان ہو گئی لیکن فوراً ہی 'ہاں' کہہ دیا۔ اس کے چہرہ پر حیا کی لہر دوڑ گئی۔

ایک چھوٹا سا ہوٹل دیکھ کر ہم دونوں اندر چلے گئے۔ چائے پی۔ میں کسی بھی موضوع پر اس سے بات کرنے میں جھجک محسوس کر رہا تھا۔ وہ بھی نہ جانے کیوں خاموش خاموش سی تھی۔ مجھے تو اس کی چڑیا والی چوں چوں یاد تھی۔ چائے کا سلسلہ پورا ہوا "کیا میں آپ کو گھر تک چھوڑنے آسکتا ہوں؟"
"کیوں نہیں؟" اسکوٹر پر وہ اپنی عادت کے مطابق اپنے آپ میں کھوئی ہوئی گم سم بیٹھی تھی۔ اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر وہ اپنے آپ کو اس طرح سمیٹ کر اور اپنے آپ کو سنبھال کر بیٹھی ہوئی تھی کہ جب کبھی اسکوٹر کو میں بریک لگاتا اس کا ذرا سا بھی لمس مجھے نصیب نہیں ہوتا۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ یہ تو کوئی بے جان مورتی ہے۔ میں نے ہی باتیں کرنی شروع کیں "کیسا لگا مشاعرہ؟" وہ اپنے شعر سنانے لگی۔ میں اس کی آواز کے جادو میں گم ہونے لگا۔ اس کا گھر نزدیک آرہا تھا۔ میں نے اس کو ٹٹولنے کے لیے کہا "میں آپ کو یہاں اُتار دوں کہ گھر تک؟ مجھے آپ کے گھر والوں کے مزاج کا پتہ نہیں ہے۔ آپ ہی بتائیے"۔

اس نے بہادری سے کہا "گھر کے نیچے چھوڑیے یا گھر میں چلیئے۔ کیا آپ گھر میں ایک چائے کا کپ بھی نہیں پئیں گے؟" میرے من میں لڈو پھوٹنے لگے۔ میری ہمت بڑھ گئی۔ جب وہ اسکوٹر سے اُتری تو میں نے کہا "آپ کا ساتھ بہت خوبصورت لگا"۔ وہ مسکرائی، شکریہ ادا کرتے ہوئے بات بدلتے ہوئے کہا "آپ گھر چلیئے۔ میرے گھر والے آپ سے مل کر ضرور خوش ہوں گے"۔ میں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "اگلی بار آوں گا"۔

ایک دو دن کے بعد میں اپنے شہر کے لیے اپنی گھر والی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ خیالوں اور خوابوں میں تو سندھیا ہی تھی۔ آٹھ دس دن کے بعد پوسٹ آفس سے ایک بڑا سا رنگین لفافہ آیا، جو بہت وزنی تھا۔ رنگین خوبصورت لفافے پر رنگین قلم سے میرا پتہ لکھا ہوا تھا۔ میں تحریر نہیں پہچان سکا اور پیچھے بھیجنے والے کا نام اور پتہ بھی نہیں تھا۔ کمرے میں جا کر میں اپنے ٹیبل کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ لفافہ کھولتے ہی خوبصورت سے آٹھ دس رنگین اوراق نکل آئے۔ تحریر خوبصورت نہیں تھی لیکن لکھی ہوئی باتیں بہت ہی دلکش اور خوبصورت تھیں۔ وہ سندھیا کا خط تھا۔ میری تخلیقات کا اس پر جو اثر پڑا تھا، اس کے بارے میں اس نے لکھا تھا۔ اس کا چہرہ میری انکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ لگتا تھا اس نے میرا ایک ایک لفظ گہرائی سے پڑھا تھا۔

میری کہانیوں کے کرداروں سے وہ آشنا تھی اور انھیں سمجھنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اسے میری زبان بہت ہی اچھی لگی تھی۔ میری لکھی ہوئی غزلیں اور نظمیں اسے یاد ہو گئی تھیں۔ ایک تخلیق کار کو اور کیا چاہیے؟ ایک تخلیق کار دوسرے تخلیق کار سے حسد کرنے کے عوض اس کا مداح بنے، یہ اس کے لیے بڑی اہمیت کی بات ہے۔ میں اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ اچھا ادیب سمجھنے لگا۔ اس نے لکھا تھا، "اُٹھتے بیٹھتے، سوتے، جاگتے، آپ کی تخلیقات میں ہی کھوئی رہتی ہوں۔ کسی کام سے میرے شہر میں جب آئیں تو میرے گھر ضرور آیئے گا۔ میرے لیے پڑھنے لائق اچھی اچھی کتابیں بھی ضرور لایئے گا"۔ میں نے کسی نہ کسی بہانے اس کے شہر جانے کے بارے میں سوچ لیا۔ اُسے فوراً ایک خط لکھا...... دو تین دنوں کے لیے تمہارے شہر آرہا ہوں۔ میں اس کے شہر میں اپنے کسی رشتے دار کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں نے اسے فون کیا تو میری آواز سنتے ہی وہ جیسے خوشی سے ناچ اُٹھی۔ جلدی جلدی بہت سارے سوالات پوچھنے لگی "کب آئے؟ کہاں اُترے ہیں؟ جلدی سے میرے گھر آیئے! میں لینے آؤں؟" مجھ سے ملنے کے لیے اس کی اتنی بے چینی، اپنائیت اور خواہش دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ میں نے شام کا وقت دیا۔ پہلے تو میں نے اسے کسی ریسٹورنٹ یا پارک میں ملنے پر اصرار کیا۔ اس کے گھر پر جانا مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن وہ تو گھر پر ہی آنے کی ضد کر رہی تھی۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ گھر بھی کسی سے ملنے کیلئے ٹھیک جگہ ہے؟ اتنی بے چینی، اتنی بے تابی تھی اس سے تنہائیوں میں ملنے کی۔ غصے میں میں نے اسے بے وقوف، پگلی بھی کہہ ڈالا پھر میرے خیالات نے ایک اور موڑ لے لیا۔ ہو سکتا ہے وہ اکیلی رہتی ہو؟

اس لیے بار بار گھر پر بلا رہی ہے۔ پچھلی بار بھی اس نے گھر چلنے کے لیے کہا تھا۔ ضرور اس کے گھر میں تنہائی ہو گی۔ شاید میں ہی بے وقوف ہوں کہ اس عورت کو سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ تھوڑی سی کتابیں ساتھ میں لے کر، دھڑکتے دل سے، پیار کے نشے میں ڈوبے ہوئے من سے میں نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولنے والا دس گیارہ سال کا ایک خوبصورت گول مٹول چھوٹے قد کا لڑکا تھا جس نے مجھے کہا "ہیلو انکل! ممی آپ کا انتظار کر رہی ہیں"۔ میں حیران ہو گیا۔ "انکل، آپ کی تصویر بہت سی کتابوں میں ہے۔ ممی نے دکھائی ہے، یہ بھی بتایا کہ آج آپ آنے والے ہیں"۔ اتنے چھوٹے بچے کے منہ سے اتنی باتیں سن کر میں حیران ہو گیا اور سندھیا پر تھوڑا

ساغصہ بھی آنے لگا۔ پھر پانی کا گلاس اور ایک پلیٹ میں بسکٹ لے کر ایک بارہ تیرہ سال کی سانولی سلونی، خوبصورت آنکھوں والی ایک لڑکی اندر آئی "ہیلو انکل، خوش آمدید! ممی بس ابھی آرہی ہیں"۔ میں نے دونوں بچوں سے ہی بات چیت شروع کردی۔ دونوں بچے کمال کے تھے۔ لڑکی کلاسیکل ڈانس میں مشہور تھی۔ جگت گرو شنکر آچاریہ کے ہاتھوں سے اس نے بہت سارے انعام پائے تھے۔ پینٹنگ کے امتحانات بھی دیے ہیں۔ لڑکا ناچ، تیراکی، بیڈمنٹن، کراٹے اور گٹار میں ڈھیر سارے انعام پاچکا تھا۔ میں ان کا پیار اور اپنائیت دیکھ کر اپنی بدنیتی سے کانپنے لگا۔ دونوں بچے جیسے مجھ پر قربان ہورہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دونوں میرے پرانے مداح ہیں۔

انھوں نے اپنی اپنی ڈائری میں میری رائے اور دستخط لیے۔ اسی وقت سندھیا آئی۔ اس نے بچوں کو میٹھی ڈانٹ دیتے ہوئے کہا "انکل کو اتنا پریشان کرتے ہیں کیا؟" اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگی "معاف کرنا، آپ کو زیادہ پریشان تو نہیں کیا؟" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں تو یہ بھی بھول گیا تھا کہ آپ سے ملنے آیا ہوں۔ میں تو اِن بچوں کے پیار اور اپنائیت میں ڈوب گیا۔ بہت ہی ہونہار بچے ہیں۔ خدا ان کا بال بھی بیکا نہ ہونے دے"۔ اس نے شکریہ بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور ان سے کہا "اب انھیں اور پریشان مت کرو، تمہارے انکل سے میرا بہت سارا کام ہے"۔ بچوں نے وداعی لیتے ہوئے کہا "اچھا، ممی شام کو ملیں گے"۔ اور وہ دونوں چلے گئے۔ کمرے میں خاموشی چھاگئی۔ پورے گھر میں اب ہم دونوں اکیلے تھے۔ میرا پورا دھیان اس کی طرف گیا۔ اس نے کہا "چلو، اب میں اپنا گھر دِکھاتی ہوں"۔ ایک کمرے میں لے جاکر اس نے کہا "یہاں میں لکھتی پڑھتی ہوں۔ یہ میرے کتابوں کی چھوٹی سی لائبریری ہے...... وہ تخلیق میں نے یہیں لکھی تھی۔ یہ تصویر مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ یہ میرا ستار ہے جس کی لے میں کبھی کبھی چھیڑتی ہوں۔ یہ رہا میرا ہارمونیم جو میں گاتے وقت یا موسیقی کی ریاضت کرتے وقت بجالیتی ہوں۔ یہ میری پسند کے کیسٹس ہیں اور یہ میری بیٹی کی پسند کے۔ بہت ہی پرانی فلموں کے گانے میرے شوہر کو اچھے لگتے ہیں۔ ہم چاروں کی پسند الگ الگ ہے لیکن دل ملے ہوئے ہیں۔ اتنا کہہ کر وہ بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ کے بہت ہی قریب تھا۔ وہ میرے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "بہت ہی چھوٹے چھوٹے نازک اور خوبصورت ہیں تمہارے ہاتھ! گھر کا

کام کاج کرنے کے بعد بھی یہ کھردرے کیوں نہیں؟" اس نے آہستہ سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا "آپ ہال میں بیٹھیے۔ میں آپ کیلئے چائے بنا کر لاتی ہوں"۔ مجھے ہال میں بٹھا کر ایک فائل میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے اس نے کہا "اس میں میری تخلیقات ہیں، تب تک آپ پڑھتے رہیے"۔

میرا پورا دھیان اس کی آہٹ، اس کے جسم کے حصے، اس کے خوبصورت پاؤں، مدہوش کرنے والی آنکھوں اور آواز میں اٹکا ہوا تھا۔ اس کی فائل کھولنے کو بھی دل نہیں کر رہا تھا۔ وہ چائے لے کر آئی اور قریب بیٹھ کر کہنے لگی "کیسی لگی میری تخلیقات؟" میں نے اسے اس کی لکھی ہوئی غزل دے کر کہا "اسے ترنم میں سناؤ!" اس نے غزل گنگنانا شروع کیا وہ اپنے آپ میں ہی کھو گئی تھی۔ نہ جانے کون سے سماوی سنسار میں کھو گئی تھی۔ گھر کا سناٹا اس کی مدھر آواز، اس کے جسم کی خوشبو نے مجھے مدہوش بنا دیا۔ میرے ہاتھ اُٹھے اور اسے گلے لگانے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ سہمی ہوئی ہرنی کی طرح چونک گئی۔ اپنے آپ کو چھڑا کر چھلانگ لگا کر وہ دور جا کر کھڑی ہو گئی۔ میں اس کے آگے منت کرنے لگا "میں تمھیں بہت پیار کرتا ہوں سندھیا۔ گزرے ہوئے چار پانچ سالوں سے میں تمہارے لیے تڑپ رہا ہوں۔ تم بھی مجھے ضرور چاہتی ہو گی۔ روح سے روح اگر جڑی ہوئی ہو تو یہ دو جسموں کے بیچ میں دوری کیوں؟"

اس کی آنکھیں انگارے اُگلنے لگیں۔ اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا "خبردار، جو آگے بڑھو گے! میں آپ کی تخلیقات سے پیار کرتی ہوں۔ آپ کی کہانیوں کے ہیرو اور ہیروئین سے پیار کرتی ہوں۔ میرے من میں ایک ادیب کے روپ میں آپ کے لیے پیار، عزت اور عقیدت ہے۔ دیگر ادیبوں کے ساتھ صلاح مشورہ کر کے اپنے آپ کو ایک اچھا ادیب بنانے کی چاہ ہے۔ من کا رشتہ، دوستی کیا صرف اپنی ہی صنف سے ہو سکتی ہے؟ کیا دو مخالف صنف والے مرد اور عورت کے بیچ میں من اور خیالوں کا رشتہ ہونا ممکن نہیں ہے؟ کیا عورت صرف ایک جسم ہے؟ کیا مرد کو عورت کا صرف ایک جسم ہی دِکھائی دیتا ہے؟ اور کوئی رشتہ ممکن نہیں ہے؟" میرے ہوش اُڑ گئے تھے۔ میں اسے جسمانی طور پر پانے کے لیے بے چین تھا۔ میرا ضمیر کام نہیں کر رہا تھا۔ "جسم کے ملن کے بغیر کیسا پیار؟ تم نے مجھ سے کہا تھا، تم مجھے چاہتی ہو۔ مجھے گھر میں اکیلا کیوں مدعو کیا؟ تنہائی میں کیوں ملی؟ دیکھو، شرماؤ نہیں۔ گھبراؤ مت! دیکھو تم ایک نئے زمانے کی

عورت ہو۔ آج کل یہ سب کچھ چلتا ہے"۔ میں دیوانہ بن کر اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ اس نے مجھے زور سے دھکا مارا اور خود کو میری پکڑ سے چھڑا کر دور کھڑی ہو گئی۔ اپنے ہاتھ میں ایک وزنی پیپر ویٹ اٹھا کر میری طرف دکھا کر کہنے لگی "اگر آپ میرے نزدیک بھی آئے تو میں آپ کا قتل کر دوں گی"۔ ہم دونوں کی سانسیں پھولنے لگی تھیں۔ اس کی وہ ذلت آمیز آواز، بذات خود درگا ماں جیسا بھیانک روپ اور ہاتھ میں ترشول کی جگہ وزنی پیپر ویٹ دیکھ کر میں کانپ اُٹھا۔ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پیپر ویٹ تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ مجھے پانی کا گلاس دے رہی تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ میری اس طرح کی حرکت کرنے پر بھی اس کے اندر کی تہذیب اور مہمان نوازی کو دیکھ کر میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ میں اس کے بچاؤ کی ڈھال پیپر ویٹ کو دیکھتا ہی رہا۔ کمرے میں سناٹے کے علاوہ ہم دونوں کی سانسوں کی آواز تھی۔ وہ دھیرے دھیرے پانی پی رہی تھی اور میں بھی۔

اچانک! دروازے پر دستک ہوئی۔ سندھیا نے اپنے بال سنوارے۔ چہرے کے جذبات بدلنے کی کوشش کی اور دروازہ کھول دیا۔ ایک سانولے رنگ کے، متوسط قد والا مرد اندر آیا اور کہا "ہیلو مسٹر! میں دیر سے تو نہیں آیا۔ میری بیوی سندھیا آپ کی تخلیقات کی دیوانی ہے۔ آپ کی دو تین کہانیاں مجھے پڑھ کر بھی سنائی ہیں۔ واہ! صاحب مزہ آگیا آپ سے مل کر"۔ سندھیا کی طرف دیکھ کر وہ کہنے لگا "بی بی جی، دیر تو نہیں ہوئی آنے میں؟ دیکھو پورے دو گھنٹے پہلے دکان بند کر کے آیا ہوں۔ ادیب صاحب کو اپنا شہر گھمانے کے لیے کار بھی حاضر ہے۔ ایک شاندار ہوٹل میں ٹیبل بھی ریزرو کر دی ہے۔ بھائی، ہوم منسٹر کا حکم کیسے ٹال سکتا ہوں؟" اتنا کہہ کر اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بڑی شرارتی مسکان سے اپنی بیوی کی طرف دیکھنے لگے۔

میں اپنے پژمردہ، بے جان اور زخمی ضمیر کے ساتھ صاف ستھرے دل والے سندھیا اور اس کے شوہر کو دیکھنے لگا۔ سندھیا اندر تیار ہونے کے لیے چلی گئی۔ سندھیا کے پتی نے میری تعریف کے پل باندھتے ہوئے کہا "بھائی، آپ کی کہانیوں کے کردار بہت عظیم اور آدرش ہوتے ہیں۔ وہ کوئی نہ کوئی سبق دیتے ہیں"۔ میں نے "ہاں" کہتے ہوئے گردن ہلائی اور اپنی نئی کہانی کی ہیروئین سندھیا کے بارے میں سوچنے لگا۔



گردش

مونیکا اپنی سیٹ چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں حیران ہوئی کیونکہ بہت دیر تک کھڑی رہنے کے بعد ہم دونوں کو بیٹھنے کی سیٹ ملی تھی۔ میں نے بس کی سیٹ کی طرف دیکھا جہاں سے وہ چڑچڑی اور بے چین ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔ بائیس تئیس سال کا ایک لڑکا اپنے ہی خیالوں میں گم سم سا وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ وہ مونیکا کی حرکت سے بالکل انجان اپنے آپ میں ہی کسی خیال میں کھویا ہوا بیٹھا تھا۔ مونیکا نے اشارے سے دکھایا کہ وہ لڑکا اسے چھونے اور تنگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

چار پانچ منٹ کے بعد اس نے کہا "سریتا! اب ہم آنے والے اسٹاپ پر اُتر جائیں گے"۔ وہ آس پاس بیٹھے اور کھڑے ہوئے مردوں کی طرف خوفناک نظروں سے دیکھنے لگی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے سبھی مرد اسے کچا چبانے کی سازش کر رہے ہیں۔ میں نے اس کی بات ماننے میں اپنی بھلائی محسوس کی۔ میں سوچ میں پڑ گئی کہ پچپن سال کی عمر کو پار کرنے والی مونیکا ایسا برتاؤ کیوں کر رہی ہے؟ وہ بے چینی سے باتیں کرتی جا رہی تھی، "میں اِن مَردوں کی ذات کو اچھی طرح پہچانتی ہوں"۔ ہمارا مقرر کردہ اسٹاپ آنے تک وہ مردوں کی برائیاں کرتی رہی۔

مونیکا سے میری ملاقات ایک عجیب اتفاق سے ہوئی۔ ایک بار شام کے وقت میں کچھ خریداری کرنے کے لیے گھر سے باہر نکلی تو فٹ پاتھ پر ایک عورت کو اپنی طرف لگاتار گھورتے ہوئے دیکھا۔ درمیانہ قد کی اس عورت نے ہلکے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں سونے کی دو چوڑیاں اور گلے میں ایک چھوٹا سا منگل سوتر پہنا تھا۔ اس نے بولنے کی شروعات کرتے ہوئے

کہا"میں مسز مونیکا ہوں۔ آپ کے بال بہت خوبصورت کٹے ہوئے ہیں۔ آپ بال کہاں کٹواتی ہیں؟ کیا آپ اپنا وقت نکال کر مجھے وہاں لے چلیں گی؟" میں نے کھلے دل سے اپنے بیوٹی پارلر کا نام اسے بتایا اور پتہ بھی دیا۔ اس نے کہا"میں اس شہر میں نئی نئی آئی ہوں۔ میرے پتی ایک فیکٹری میں بڑے عہدہ پر کام کرتے ہیں۔ ہمیں اس شہر میں آکر کچھ ہی مہینے ہوئے ہیں۔ کل آپ میرے ساتھ چلیں گی؟" میں نے گردن ہلا کر ہاں کر دی۔ اس طرح پہلی ملاقات میں ہی اس نے میرا گھر، فیملی کے افراد، آس پاس رہنے والوں کے نام، میری نوکری اور میرے معمولات جان لیے۔ میں نے اسے اپنا پتہ بھی دیا۔ دوسرے دن مقررہ وقت پر ٹھیک پانچ بجے وہ میرے گھر آئی۔ اس دن کے بعد روزانہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر باہر گھومنے کے لیے وہ لوگ ہر روز آنے لگی۔ میں ایک ملازمت پیشہ عورت۔ صبح گھر سے چھ بجے نکلتی اور دو تین بجے گھر آتی۔ گھر میں آتے ہی کام کاج کا راکشس منہ پھاڑے بیٹھا رہتا۔ گھر میں دو بچے تھے۔ ساتویں آٹھویں جماعت میں پڑھنے والے۔ ان کا کھانا پینا، کپڑے، یونیفارم کی دیکھ بھال کرنی ہوتی۔ ان کی باتیں دھیان سے سن کر، ان کی ہر طرح کے مسائل سلجھانے پڑتے۔ گھر میں کھان پان کا انتظام کرنا، پورے گھر گرہستی کو ایمانداری سے سنبھالنا پڑتا تھا۔ اتنے مصروف پروگرام میں اپنے لیے چرائے ہوئے لمحات قیمتی ہوتے تھے۔ شام کے وقت اپنے ہی خیالات میں ڈوب کر اکیلی چلتے رہنا اور سبزیاں خریدنا مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ مونیکا کے روز گھر آنے سے میرے گھر کے معمولات ڈانواڈول ہوگئے تھے۔ کوئی بھی کام ٹھیک طرح سے نہیں ہو پا رہا تھا۔ نہ میں اپنے آپ کو وقت دے سکتی تھی اور نہ اپنے بچوں کو۔ بچے پریشان ہونے لگے، گھر بھی گندہ رہنے لگا۔ سب الٹا پلٹا ہو رہا تھا۔ آخر میں نے ایک دن فون کر کے اس سے کہا"بچوں کے امتحانات نزدیک ہیں۔ مہربانی کر کے کم سے کم دو ہفتے ملنے نہیں آنا۔" اس نے میری بات مان لی۔

آٹھ دس دن کے بعد میری بیٹی نے جس حال میں اسے دیکھا وہ سن کر میرا دل پگھل گیا۔ اس کے کپڑے میلے تھے۔ چہرہ پیلا ہو گیا تھا۔ جسم کانپ رہا تھا۔ اپنے آپ سے باتیں کرتی جا رہی تھی وہ۔ میری بیٹی کو بھی اس نے پہچانا نہیں۔ میری بیٹی کی سہیلیوں نے تو اسے پاگل عورت سمجھا اور ہنسنے لگیں۔

یہ باتیں سن کر اس کے لیے میرے دل میں ہمدردی پیدا ہوئی۔ ان مہینے دو مہینوں میں اس نے مجھے کوئی خاص شکایت کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ لیکن کبھی کبھی اس کا برتاؤ غیر معمولی ضرور لگا تھا اور ایسا برتاؤ دو تین بار دہرایا بھی گیا تھا۔

جیسے مجھے یاد آیا کہ ایک بار ہم کسی دکان پر کچھ خریداری کرنے گئے تو وہ عجیب آواز اور بڑے نخرے سے کہہ رہی تھی "یہ آپ کیا دکھا رہے ہیں؟ یہ چیز کسی لڑکی کو خوبصورت لگے گی۔ میں کوئی نوخیز تھوڑے ہی ہوں"۔ یہ سنتے ہی دکاندار اس کی طرف غور سے دیکھتا تھا۔ کوئی چالاک دکاندار مسکرا کر کہتا تھا "بہن، عمر سے تو آپ اتنی بڑی نہیں دِکھائی دیتیں۔ آپ تو بہت چھوٹی دِکھائی دیتی ہیں"۔ یہ بات سنتے ہی اس کا چہرہ چمک اُٹھتا تھا اور وہ دکاندار سے ڈھیر ساری چیزیں خرید لیتی تھی۔ میں اس کی اس عادت سے بہت ناراض ہو جاتی تھی۔ لیکن وہ مجھے سمجھاتے ہوئے کہتی "مجھے وہ لڑکیوں والی چیزیں کیوں دکھاتے ہیں؟" میں اسے سمجھاتے ہوئے کہتی "تم اسے کہہ سکتی ہو کہ ہلکے رنگ دِکھاؤ۔ کان کے چھوٹے چھوٹے نازک جھمکے دِکھاؤ۔ ہر بات میں تم عمر کی بات کیوں کرتی ہو؟ یہ بات ٹھیک نہیں لگتی۔ ہر ایک انسان کے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کے لیے اپنی اپنی انفرادی پسند ہوتی ہے۔ ہر بات میں اپنی عمر کے بارے میں لوگوں کو کہتے رہنا عجیب سا لگتا ہے"۔

مونیکا شاید بحث کرنے کے موڈ میں تھی، کہنے لگی "کچھ عورتیں بھڑکیلے چمکیلے ریشمی کپڑے اور عجیب عجیب زیورات پہنتی ہیں۔ اپنی بڑھتی ہوئی عمر کو بھلانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ میں ایسی عورتوں میں سے نہیں ہوں۔ مجھے ایسی عورتیں پر غصہ آتا ہے"۔

اس کی دلیل سن کر میں زور سے ہنس پڑی۔ تم اپنی پسند دوسروں پر کیوں لادتی ہو؟ تمھیں ایسا اختیار کس نے دیا ہے؟ برا نہ مانو تو تمھیں میں ایک بات بتاؤں؟ تم ان سبھی عورتوں میں سے ہو جو اپنی عمر کو چھپانے کی کوشش کرتی ہیں۔ سفید بالوں کا کالا یا براؤن کرنا، بیوٹی پارلر میں جا کر مالش، فیشیل کروانا، ناز نخروں سے باتیں کرنا، کیا یہ سب اپنی بڑھتی ہوئی عمر بھلانے کی کوشش نہیں ہے؟ تم صرف کپڑوں کے رنگ میں اٹکی پڑی ہو۔ جو ہر ایک انسان کی اپنی پسند پر منحصر رہتا ہے، عمر پر نہیں۔

ایک لمحہ کے لیے اس کا چہرہ مرجھا گیا اور وہ آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اپنے آپ کو آئینے میں غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی 'سریتا، تم نے سب سچ کہا۔ بچپن سے میرے دل میں ایک سوئی چبھتی رہتی ہے۔ ہم اپنی ماں کی تین بیٹیاں تھیں۔ میں سب سے بڑی تھی۔ میرا رنگ سانولا تھا۔ ممی میرے لیے ہلکے رنگ کے کپڑے لاتی تھی۔ خوبصورت اور گوری بہنوں کے لیے گہرے رنگ کے ریشمی کپڑے۔ سب مجھے میری عمر کا اور رنگ کا احساس دلاتے رہتے تھے۔ کہتے تھے تم بڑی ہو، چھوٹی بہنوں کو اچھے کپڑے پہننے دو۔ میرا دل ایسی قربانیوں کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ مجھے 'بڑی' لفظ سے ہی غصہ تھا۔ میری دونوں بہنیں بہت خوبصورت تھیں۔ سج دھج کر وہ جب جاتی تھیں تو جیسے شہزادیاں لگتی تھیں۔ میں تو جلن کے مارے بجھی بجھی، تھکی اور غمزدہ دِکھائی دیتی تھی۔ لڑکے والے مجھے دیکھنے کے لیے آتے تھے اور میری بہنوں کو پسند کر لیتے تھے۔ میری دونوں بہنوں کی شادیاں بھی مجھ سے پہلے ہو گئی تھیں۔ مجھے خوبصورت عورتوں سے نفرت ہے۔ وہ سب کچھ چھین لیتی ہیں"۔ اس کے خیالات سن کر میں کچھ کہنے ہی جا رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ گھر میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں نے بتی جلائی نہیں تھی۔ میرے پتی گھر آگئے تھے اور کھانا پروسنے میں مجھے دیر ہوئی تھی۔ میں نے مونیکا سے جلدی میں وداعی لی۔ لیکن دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا تھا کہ مونیکا ایک نفسیاتی موضوع ہے جس کا مطالعہ میں ضرور کروں گی۔ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانکاری حاصل کروں گی۔ اس کے لیے مجھے اس سے بار بار ملنا چاہیے۔

سنیچر کا دن تھا۔ میں اپنے روزمرہ معمولات میں مصروف تھی اور ہمیشہ کی طرح خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں اپنے خیالات سے ایک دم چھلانگ لگا کر باہر نکل آئی۔ مونیکا کا ہی فون تھا۔ اس کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی "سریتا، جلدی گھر چلی آؤ۔ مجھے تمہاری بڑی ضرورت ہے"۔ اس نے مجھے گھر کا پتہ دیا۔ اس کی آواز میں کچھ ایسا تھا کہ جس نے میرے دل کو چھو لیا۔ سبھی کام کاج چھوڑ کر اپنے پتی سے کہہ کر میں اس کے گھر پہنچی۔

گھر کا دروازہ اس نے ہی کھولا۔ وہ بہت ہی تھکی تھکی سی تھی۔ ہم دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں نے حال چال پوچھنا شروع کیا۔ وہ بہت غمزدہ دِکھائی دے رہی تھی۔ جسمانی طور پر وہ ٹھیک تھی۔ وہ کہنے لگی "صبح سے نہ جانے کیوں میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ خودکشی کرنے کے خیال

آرہے ہیں۔ اکیلی جو بیٹھی ہوں"۔

میں نے پوچھا "تمہارے بچے کہاں ہیں؟" اس نے متعجب ہو کر پوچھا "بچے؟ مجھے بچے نہیں ہیں اور نہ ہی مجھے بچے پیدا کرنے کا شوق ہے۔ مجھے تو بچے اچھے لگتے ہی نہیں"۔

اس کے خیالات سن کر میں کانپ اُٹھی۔ دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ اس کی نجی زندگی کے بارے میں جانکاری لے لوں گی۔ ماحول میں اس کی کڑوی باتوں سے تناؤ سا پھیل گیا تھا۔ اسے مصروف رکھنے کے لیے میں نے زور سے ہنسنے کا سہارا لیا اور کہا "اچھا مونیکا، چائے بھی نہیں پلاؤ گی کیا؟ کم سے کم پانی تو پلاؤ گی نا؟ رسوئی گھر کہاں ہے؟ میں خود اپنے لیے پانی لاتی ہوں"۔ وہ چونک اُٹھی اور 'ساری' کہہ کر رسوئی گھر میں پانی لانے کے لیے چلی گئی۔ میں اس کے خیال اور فطرت جاننے کے لیے ہال میں رکھی چیزیں دیکھنے لگیں۔ اس کے ویڈیو پر رکھے ہوئے کچھ ویڈیو کیسٹس دیکھ کر میں چونک گئی۔ ان میں سے بہت سارے کیسٹس فحش تھے۔ ٹیبل پر رکھے رسالے بھی کچھ اسی طرح کے تھے۔

چائے پیتے پیتے میں نے اس سے ذاتی سوالات پوچھنے شروع کیے، جس سے پتہ چلا کہ اس کے شوہر زیادہ تر کارخانے کے کام سے گھر سے باہر رہتے ہیں۔ نوکری ہی اس قسم کی تھی کہ کام کے سلسلے میں دوسرے شہروں میں جانا اور رہنا پڑتا تھا۔ اس کی کالونی میں کوئی بھی عورت اس کی سہیلی بننے کے قابل نہیں تھی۔ وجہ پوچھنے پر اس نے کہا "وہ لوگ سارا وقت اپنے پتی اور بچوں کے بارے میں بولتی رہتی ہیں۔ مجھے تو ان دونوں موضوع میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں کیا بات کروں؟ مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں"۔ ان باتوں کو دہراتے ہوئے اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ موضوع بدلتے ہوئے میں نے اپنے پرس میں سے مونگ پھلی کی ایک پڑیا نکال کر اس کو دیتے ہوئے کہا "آؤ، ہم اسے کھاتے ہیں"۔ اس نے انکار کرتے ہوئے کہا "میں بچوں کی طرح پڑیا سے مونگ پھلی کھانا پسند نہیں کرتی۔ اس عمر میں یہ زیب نہیں دیتا"۔ اس کی نظر میں نفرت تھی۔ مجھے تو اس پر غصہ ہی آیا۔ سوچنے لگی، آ گئی نہ اپنے موضوع 'عمر' پر! اب اس سے کیا بات کروں؟ جس میں عمر کا ذکر نہ ہو، بچے نہ ہوں، پتی کا موضوع نہ ہو۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی بے معنی باتیں کر کے میں نے اس سے وداعی لی۔ گھر پر آتے ہی کام کاج میں مصروف ہو گئی۔ کچھ دنوں کے لیے

میری نند اپنے بچوں کے ساتھ میرے یہاں رہنے کے لیے آئی تھی۔ میں تو اپنے لیے بھی وقت نہیں نکال سکتی تھی۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ میں اپنے بچوں کے ساتھ بڑے آرام سے ٹی وی دیکھ رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجانے کے بجائے کوئی زور زور سے دستک دینے لگا۔ دروازہ تھپتھپانے کی آواز زور زور سے آرہی تھی۔ میری بیٹی نے دروازہ کھولا۔

گھبرائی ہوئی مونیکا گھر میں آئی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اندر کمرے کی طرف گھسیٹنے لگی۔ میں نے اپنے بچوں کو اِشارہ کیا کہ وہ دور ہی بیٹھے رہیں۔ وہ گھسیٹتی گھسیٹتی مجھے کمرے کی کھڑکی کی طرف لے آئی اور راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "دیکھو، وہ مَرد میرا پیچھا کر رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر اشارے کر رہا ہے، میں چھوٹی اور خوبصورت جو دکھائی دے رہی ہوں"۔ میں نے اس سے کہا "مونیکا، یہ تو چھوٹے بچے ہیں۔ تمہارے اپنے بچے ہوتے تو یہ تمھیں اُنھیں کی طرح دِکھائی دیتے۔ یہ بچے تمھیں کیوں چھیڑیں گے؟ تمھیں کیوں دیکھیں گے؟ جب ان کی ہم عمر لڑکیاں راستے پر گھوم رہی ہیں۔ مونیکا اِن لڑکوں کی نظر میں تم ماں یا خالہ ہو۔ وہ تو اپنی ہی موج میں مست گاتے جھومتے باتیں کرتے جا رہے ہیں"۔ ایک لمحہ میں اس کا چہرہ بجھ گیا۔ وہ مایوس ہو گئی اور کمرے میں رکھے آئینے میں دیکھنے لگی جیسے اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے اس کمرے کا دروازہ بند کر لیا، کہیں میرے بچے ہم دونوں کی باتیں سن نہ لیں۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ چلی گئی۔ میرے لیے کئی سوال اور دلچسپی چھوڑ کر......

تھوڑے دنوں میں مونیکا اور میری ملاقات ایک جوتے کی دکان پر ہو گئی۔ خریداری کرنے کے بعد ہم ایک پر سکون ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ کچھ ٹھنڈا لانے کا آرڈر دیا۔ میں نے اس سے پوچھ لیا "تمہارا پتی اتنا وقت غائب کیوں رہتا ہے؟ ایسی کون سی نوکری ہے؟ کون سی ایسی مجبوری ہے جو تم دونوں اکیلے اکیلے رہتے ہو؟"

"میں ادھوری عورت جو ہوں۔ میں نے بہت سارے علاج کروائے، تکمیل پانے کے لیے، بچے پیدا کرنے کے لیے۔ لیکن اس بے کار جسم کا کیا کروں؟ علاج، دعائیں اور ڈھیر سارے پیسے سب بے کار ہو گئے۔ آخر تھک ہار کر میں نے ممتا کا دروازہ بند کر لیا اور تالا لگا کر کنجی کسی گہرے سمندر میں پھینک دی۔ اپنے شوہر کو قابو میں رکھنے کے لیے اس جسم کو سجایا، سنوارا، جگایا۔

تخلیق نہ کر پانے والے اس ادھورے جسم کو مینکا بنایا۔ میری چال، چہرہ، آواز اور گھر کے ماحول میں خواہش سما گئی۔ اس وجہ سے میرا پتی مجھ سے پیار کرتا ہے، مجھے وہ چھوڑ کر نہ جائے، یہ سب کچھ کرنا میرے لیے کتنا مشکل ہے، سریتا!"

ایک ہی سانس میں اتنا کہنے کے بعد وہ تھک گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ہمارے آرڈر کیے ہوئے مشروب رکھ کر ویٹر چلا گیا۔ میں چپ چاپ آرنج جیوس اور وہ کافی پینے لگی۔ اس کے بعد ہم دونوں باہر نکلے۔

باہر آنے پر میری نظر ان خوبصورت پھولوں کے ہار پر گئی۔ مجھے موگرا کے خوشبودار پھول بہت پسند ہیں۔ میں نے دو گجرے خرید لیے۔ ایک میں نے بالوں میں لگالی اور دوسرا اسے دے کر بڑے پیار سے دیکھا تو اس کی پلکوں پر آنسو جھلملانے لگے جسے وہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ میں نے ہلکی سی چٹکی کاٹتے ہوئے شرارت بھری آواز میں کہا "تو پتی کا پیار حاصل کرنے کے لیے تم نے اتنی کوششیں کی ہیں۔ شاباش! تم نے بھی تو ستی ساوتری بن کر ستیہ وان کو حاصل کیا ہے"۔

میری محبت بھری باتوں کا اثر بھی اس پر الٹا ہو گیا۔ اس کا چہرہ لال ہو گیا اور کانپتے ہوئے لہجے میں وہ کہنے لگی "میں کچھ بھی گنوانا نہیں چاہتی، حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے رحم اور ہمدردی نہیں چاہیے اور نہ ہی ادھورا پن..... من اور تن سے صرف مجھے چاہنے والا ہو..... پر اُف..... سریتا ایسا نہ ہو سکا.....!" اس کی یہ حالت دیکھ کر میں نے آٹو رکشا بلوائی۔ اسے تھوڑا سہارا دے کر اندر بٹھا کر پرسکون رہنے کا اشارہ کیا۔ ایک فرمانبردار بچے کی طرح اس نے بھی میرا کہنا مان لیا۔ لیکن وہ ہانپتی، کانپتی، تڑپتی اور سسکتی رہی۔ میں اس کے بالوں میں انگلی پھیرتی رہی۔ اس کی گردن کو اپنے کندھوں کا سہارا دیا۔ اسے تھوڑا آرام اور راحت مل رہی تھی۔

گھر آکر میں نے اسے اندر کمرے میں لٹا دیا۔ پانی پلایا، گرم کافی کا کپ دیا۔ اس نے آنکھوں سے ہی میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پیار بھرے میٹھے لہجے میں پوچھا "مجھے آج سب کچھ بتاؤ، کچھ بھی مت چھپانا"۔

"میرے پتی نے یہ فلیٹ میرے نام پر کیا ہے اور خرچ بھی بھیجتے رہتے ہیں۔ ادھر دو تین

مہینوں کے بعد تھوڑے دنوں کے لیے آتے ہیں۔ اس بار جب وہ آئے تو بھجن کے کیسٹ اور دیواروں پر دیوی دیوتاؤں کی تصاویر لگانے کے لیے لیکر آئے۔ میرے لیے ڈھیر ساری مذہبی کتابیں لے آئے۔ مجھے 'ست سنگ' میں جانے کا مشورہ دیا ہے۔ تن اور من کو شانت کرنے کے طریقے بتانے لگے"۔

میں نے کہا "بہت اچھا، یہ تو مسرت انگیز راستہ ہے۔ تم دونوں کی بھلائی کے لیے اچھا راستہ ہے"۔ اس نے غمزدہ آواز میں کہا "دونوں کے لیے نہیں، صرف میرے لیے"۔ میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ مونیکا دھیرے دھیرے کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی اور تازہ ہَوا لینے کے لیے لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگی "سنو سریتا، میرا پتی ایک ہرجائی مَرد ہے۔ نوکری کے بہانے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ مجھے بھی آگ بڑھانے کے لیے کئی طرح کی دوائیوں اور تجربے کرنے پڑے۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتی تھی، بس جتنا ہو سکے اسے آسودہ کرنے کی کوشش کی۔ آخر اس نے بنگلور میں اپنی بیٹی جیسی کم عمر والی لڑکی سے شادی کرلی۔ اس لڑکی سے اسے ایک بچہ بھی ہے"۔ میں نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے کسی نے تم سے جھوٹ بولا ہو۔ تم کانوں سنی باتوں پر بھروسہ مت کرنا"۔

وہ زور زور سے رونے لگی اور کہنے لگی "اس نے مجھے خود ہی بتایا ہے۔ اس بات کو آٹھ مہینے ہوگئے اور ان دنوں میں ہی میری تم سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے تمہارا دامن پکڑ لیا۔ اس عمر میں جاگا ہوا جسم، مَرا ہوا من اور بھٹکی ہوئی روح لے کر میں بھٹک رہی ہوں۔ میرے دونوں جہاں تباہ ہوگئے ہیں۔ میں نہ اِدھر کی رہی اور نہ اُدھر کی...... کہتے ہیں نہ کہ 'دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا ...... یہ مرد......!'۔

بس! پھر تو مونیکا مَرد ذات کے لیے گالیاں برسانے لگیں۔ اس کی آنکھیں بھیانک ہونے لگیں، جیسے زلزلہ آگیا۔ اسے پرسکون کرنے کے لیے میری ہمت بھی جواب دے گئی۔ اس کے ٹھنڈے اور پسینے سے بھرے ہوئے ہاتھ پیروں کی میں نے مالش کرنی شروع کی۔ کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں تاکہ اسے بھرپور ہَوا ملے۔ کیا کروں؟ کیسے اسے اس دَورے سے بچاؤں؟ میں دھیمی آواز میں اسے پرسکون رہنے کے لیے کہہ رہی تھی۔

"مونیکا میری بات مانو۔ اپنے تپے ہوئے من کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرو۔ کہیں پر چھوٹی موٹی نوکری کرنا شروع کرو۔ جو کچھ تم پر بیتی ہے، اسے تم بدل نہیں سکتیں۔ اب اس کا اثر کم کرنے کی کوشش کرو۔ تم اس حالت سے باہر نکلو گی، اس بات کا مجھے پورا یقین ہے۔ میں ہوں نہ تمہارے ساتھ"۔

اس نے گردن ہلائی اور آہستہ سے مسکرائی۔ آدھے گھنٹے تک میں اس کے ساتھ بیٹھی رہی۔ اسے چپ چاپ آرام کرنے کے لیے کہا۔ بعد میں اسے اکیلے چھوڑ کر اپنے گھر چلی آئی۔

کچھ دنوں کے بعد میں نے اپنی ایک جان پہچان کے ڈاکٹر کی کلینک میں اسے نوکری دلوائی تاکہ اس کے دو گھنٹے مصروف گزریں۔ لیکن جب کبھی وہ ملتی اور میں خیر خبر پوچھتی تو ایسے لگتا کہ اپنے من پر قابو رکھنے میں وہ ناکام ہو رہی ہے۔ چار پانچ دنوں سے وہ کام پر بھی نہیں گئی تھی اور جب میں گھر پر فون کرتی تھی تو کوئی نہیں ہوتا تھا۔

آخر ایک دن مونیکا میرے گھر پر آ پہنچی۔ اس کا چہرہ پیلا، ہاتھ کانپ رہے تھے۔ مجھے کھینچتی ہوئی وہ کمرے کی کھڑکی کی طرف لے آئی اور کہنے لگی "دیکھو، وہ گندے مرد مجھے چڑا رہے ہیں"۔

...... اور نہ جانے وہ کیا کیا کہہ رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھری۔ اُف! کیسے کوئی شخص اپنے حالات کی گردش میں پھنس کر خود کا دشمن بن جاتا ہے؟ حالات کی شکار مونیکا کیا اس گردش سے نکل سکے گی کبھی؟ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔



بے فکر

"ممی، ادھر تو آؤ میرے ساتھ آکر بیٹھو۔ ممی سنتی ہو؟" وشاکھا نے کہا۔

"کیا ہوا؟" ممی نے کچن سے نکلتے ہوئے پوچھا۔

"ممی دیکھو، یہ اشتہار کتنا دلچسپ ہے۔ ۴۸ سال کے مرد کو ۴۵ سال کی عمر کی شریک حیات چاہیے۔ لکھتے ہیں، بیوہ یا طلاق شدہ!"

وشاکھا نے ممی کے دونوں ہاتھ پکڑے۔

ممی نے حیران ہو کر پوچھا "یہ اشتہار مجھے پڑھ کر سنانے کا تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"مطلب بالکل صاف ہے۔ یہ اشتہار تمہارے لیے ہے"۔

"پگلی یہ کیا کہہ رہی ہے تو؟"

وہ ممی کو گود میں بھرتے ہوئے سمجھا کر کہنے لگی......

"ممی دیکھو، مہینے بعد میری شادی ہونے والی ہے۔ تمھیں تو معلوم ہے چندر و شادی کے دوسرے ہی دن مجھے ویسٹ انڈیز لے جانے والے ہیں۔ ان کی پوسٹنگ وہاں ہو گئی ہے۔ کم سے کم تین سال تک ہمیں وہاں رہنا ہے۔ پیچھے تم اکیلی رہ جاؤ گی۔ مجھے تمہاری فکر ہوتی رہے گی۔ میں پریشان ہوتی رہوں گی، مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگے گا۔ جب سے میرا جنم ہوا ہے، تب سے آج تک نہ میں تمہارے بغیر اکیلی رہی ہوں نہ ہی تم میرے بغیر"۔

"بے وقوف کہیں کی"۔

کہتے ہوئے ممی نے وشاکھا کے گال پر ہلکے سے چپت لگاتے ہوئے کہا "نہ جانے کیا اناپ

شلپ پک رہی ہو"۔
ممی پھر کچن میں جانے لگی۔ وشاکھا اس کے پیچھے پیچھے جانے لگی۔ وشاکھا کی یہ بچپن کی عادت تھی۔ دم کی طرح ممی سے چپک کر اس کے پیچھے پیچھے گھومتی رہتی تھی۔
گھر میں جب ماں کام کرتے کرتے ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک، باغیچے میں، آنگن میں، چھت پر کام کرنے جاتی تھی، تو وشاکھا بھی ان کے پیچھے پیچھے چپک چپک کر باتیں کرتے کرتے چلتی رہتی تھی۔
ممی نے وشاکھا کا ناشتہ ٹیبل پر لا کر رکھا۔ وشاکھا نے بات پھر سے چھیڑتے ہوئے کہا۔۔۔
"میں چھوٹی سی تھی تو پاپا کا انتقال ہو گیا۔ تم نے مجھے اتنا پیار دیا۔ مجھے پاپا کے نہ ہونے کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ مجھے میکینکل انجینئر بنایا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں تمہاری ہی قربانی اور ریاضت کی وجہ سے۔ اب میں خود شادی کر کے تمہیں اکیلا چھوڑ جاؤں! میری روح اس بات کو قبول نہیں کرتی۔ نہیں تو میں اس شادی کے لیے انکار کر دوں گی اور ساری عمر کنواری رہ کر تمہارے ساتھ رہوں گی۔ جیسے تم نے اپنی پہاڑ جیسی زندگی مجھے بڑا کرنے میں گزار دی"۔
ممی نے ناراضگی دکھاتے ہوئے کہا۔۔۔
"بے وقوف لڑکی! اچانک تمہارے دماغ میں یہ کیا گھس گیا ہے! بھوسہ بھر گیا ہے؟ میں تمہارا جہیز جوڑنے کی بات سوچ رہی ہوں۔ ڈھیر ساری خریدی کرنی ہے۔ شادی کی پوری تیاریاں مجھ اکیلی کو کرنی ہے۔ کپڑے، ساڑیاں، زیور، شادی کے کارڈس چھپانا، بانٹنا۔ مجھے تو مہینہ بھی کم لگ رہا ہے۔ یوں بیت جائے گا۔ ایک ہفتہ بھر تو تمہیں بھی آفس میں جانا ہو گا"۔
وشاکھا نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔۔۔
"ممی، میں تم سے ایک پل بھی الگ رہنا نہیں چاہتی۔ آفس میں بھی نہیں جانا چاہتی۔ لیکن کیا کروں؟"
موہنی نے ٹیبل سے ناشتے کے برتن سمیٹے۔ وشاکھا اپنے کمرے میں چلی گئی تیار ہونے کے لیے۔ آفس میں تو جانا ہی تھا۔
وارڈ روب سے ہلکے نیلے رنگ کا پنجابی ڈریس نکالی اور آسمانی رنگ کا دوپٹہ جس پر بہت

خوبصورت کڑائی کی ہوئی تھی اور وہ کڑائی موہنی نے اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔ وشاکھا پر یہ ہلکا نیلا دوپٹہ جس پر بہت خوبصورت کڑائی کی ہوئی تھی۔ وشاکھا پر یہ ہلکا نیلا دوپٹہ اور وہ ڈریس بہت سجتا تھا۔

جوتوں کے ریک سے ڈریس کو میچ کرتا ہوا جوتا بھی نکال لیا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے زیوروں کے ڈبے سے مون اسٹون کے چھوٹے سے ٹاپس اور نیکلیس بھی نکالے۔ ہلکے نیلے رنگ کی کانچ کی چوڑیاں باکس میں سے نکال کر ایک چھوٹی گول بندی نکالی اور صرف کرتا ٹاول لے کر باتھ روم میں جاتے ہوئے وہ ماں کو کہنے لگی......

"ممی، میں نہانے جارہی ہوں، اگر میرا فون آئے تو کہنا کہ میں نہانے گئی ہوں"۔

"اچھا! میری بلی گبلی" موہنی نے کہا۔

باغیچے والے نل سے بالٹی بھر کر اس نے پودوں کو پانی دینا شروع کیا۔ باغیچے میں تلسی کا پودھا تھا۔ اس کے چاروں طرف تلسی کی کیاری بنی ہوئی تھی۔ تلسی میں پانی ڈالتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو شانت محسوس کیا اور وہ تلسی کے چکر کاٹنے لگی۔ تلسی کو سندور لگانے کے بعد بے خودی میں اس نے سندور بھری اُنگلی اپنے ماتھے پر بھی لگادی۔ وہ چونک اُٹھی اور اپنے دوپٹے سے سندور کو پونچھ دیا۔

بیوہ ہوتے ہوئے بھی انجانے میں اکثر وہ اپنے ماتھے پر سندور لگادیتی تھی اور یہ جیسے اس کی عادت سی بن گئی تھی۔ یہ بات اس کی عادت کا ایک حصہ تھا یا دل کے کسی کونے میں چھپی ہوئی کوئی خواہش؟

اس نے تلسی اور پیپل کے پیڑ کے آگے اگر بتی جلائی اور گھر کے آنگن میں بنے ہوئے چھوٹے سے مندر کے آگے آسن لگاکر بیٹھ گئی۔ کھلا ہوا آنگن! پیڑ، پتے، پھول، جھولے اور چھوٹے سے مندر میں دیوتاؤں کے نوانی چہرے دیکھ کر اس کے من کی گھٹن کچھ کم ہوئی۔ اس کے چہرے پر مسکان لوٹ آئی۔

اس نے پوجا کے منتروں کو پڑھنا شروع کردیا اور معمول کے مطابق پوجا کرنے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کیا۔ کاپور، چندن، اگر بتی کی خوشبو سے اس کے گھر اور من کا

آنگن مہکنے لگا۔ پھر وہ پر سکون ہو کر اپنے گھر کے اندر آئی۔ ناشتہ کیا، چائے پی۔

وشاکھا ممی ممی پکارتی ہوئی اس کے آگے آکر کھڑی ہوئی۔

"ممی کیسی لگ رہی ہوں؟"

"نیلے آسمان میں نیلے بادل کا ٹکڑا"۔

دونوں ماں بیٹی کی سریلی ہنسی کی آواز پورے ماحول میں گونجنے لگی۔ جیسے جلترنگ بج اٹھا ہو۔ وشاکھا ہنستے ہنستے ماں کی گود میں سما گئی اور اس کی پیشانی پر میٹھا سا بوسہ دے کر کہنے لگی......

"اچھا ماں چل رہی ہوں، شام کو شاپنگ کرنے چلیں گے"۔

مہکتے ہوئے چہرے سے خوشبودار سانسوں سے گھر میں تازگی بکھیر کر آفس میں چلی گئی وہ۔

ایک پل کے لیے موہنی نے اپنے آپ کو بہت ہی اکیلا اور غمزدہ پایا۔ جیسے جسم سے روح نکل گئی۔ وشاکھا کی جدائی اس کی زندگی میں نہ بھرنے والا ایک خلا تھا۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر وہ اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔ بیڈروم میں آکر اس نے اپنے شوہر سندر کا وارڈروب کھولا......

اس نے اپنے شوہر سندر کے کپڑے، اس کے انتقال کر جانے کے باوجود جوں کے توں رکھے تھے۔ سندر کے پاس ڈھیر سارے کپڑے تھے۔ ایسے لباس جو فخر کرنے کے قابل بھی تھے۔ خوبصورت فل شرٹس، ڈھیر ساری میچنگ شرٹس، جرابیں، ٹائے پنس، کفلنکو، رومال، کئی طرح کے لباس اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ جینس، نہرو پائجامے، جیکٹس، کرتا، پتلون، پٹھانی ڈریس، دھوتی کرتا اسی رنگ کی شالیں الگ الگ قسم کے رنگوں کے سویٹرز۔

وہ فخر سے موہنی کو کہتے تھے، دیکھو میرا شاہی کلیکشن راجاؤں اور راجکماروں جیسا ہے۔ اس سے میری شخصیت اور بھی چمکنے لگتی ہے۔

بیگم! جا کیمرہ تو لے آ۔ اس لباس میں میرا فوٹو نہیں ہے۔ اے میری دلربا شریک حیات اگر مجھے کچھ ہو جائے تو میرا یہ وارڈروب زندہ رکھنا۔ جیسے مصر میں ممی (لاشوں کو زندہ رکھتے ہیں)

اس نے آنسو بھری آنکھوں سے الماری کے خانے میں ہاتھ ڈال کر فوٹو کا البم نکالا۔ سندر کے اس البم میں دو ہزار سے بھی زیادہ فوٹو تھے۔ الگ الگ دیش ودیش کے لباسوں میں۔ مختلف قسم کے لباس کبھی کبھی تو کرائے کے لباس بھی پہن کر الگ الگ وِگ اور گیٹ اَپ میں بطور یادداشت

رکھنے کے لیے فوٹو نکال رکھے تھے۔ سندر کے فوٹو کا البم دیکھ کر الماری بند کر کے وہ پلنگ پر لیٹ گئی اور ایک ایک تصویر دیکھنے لگی۔

موہنی نے ہر تصویر پر تاریخ، وقت اور دن لکھ دیا تھا اور بہت سارے فوٹو کے نیچے گیت یا غزل کے اشعار جو اس فوٹو سے مناسبت رکھتے تھے، لکھ دیے تھے۔ گھنٹوں وہ اُن فوٹو کے البم کو دیکھتی رہتی تھی۔

موہنی ہر گزرتے لمحہ کو یا تو کیمرہ میں قید کرنا چاہتی تھی یا کسی گیت، غزل یا کہانی میں پکڑ کر اپنے دل میں بھر لینا چاہتی تھی۔

اپنے پتی کے انتقال کے بعد وشاکھا کے اسکول، کالج اور نوکری پر جانے کے بعد بھی اس کی یہ بھی ایک روزانہ کی مصروفیت تھی۔ اپنے پتی کی یادوں کے دِیے جلاتے رہنا اس سے اس کے تپتے ہوئے من کو شانتی ملتی تھی۔

اس نے اپنے پتی کی ہر یاد کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ سندر کی برسوں سے بنائی ہوئی لائبریری جس میں اس نے دنیا کے کونے کونے سے نادر اور بیش قیمتی کتابیں لا رکھی تھیں۔ وہ پانچ چھ زبانوں میں ماہر تھے اور پڑھ لکھ سکتے تھے۔ سب سے زیادہ اسے اپنی مادری زبان سندھی سے بے پناہ محبت تھی۔

وہ موہنی کو ایک ایک کتاب دکھاتے رہتے۔ ہر دن ہر ایک کتاب کو صاف سوکھے کپڑے سے صاف کرتے تھے۔ آجکل موہنی خود یہ کام کیا کرتی تھی۔ وہ پلنگ سے اُٹھی، ہاتھ میں جھٹکنے کے لیے صاف کپڑا لیا، کتب خانہ میں آئی اور سندر کی کتابیں جھٹکنے لگی۔ اس کی لکھنے والی ٹیبل، سندر کا آدم قد فوٹو شاہ صاحب کے کتاب کے ساتھ، اس فوٹو کو صاف کیا۔

الگ الگ فوٹو ٹیبل کارنر پر رکھے ہوئے تھے۔ ان کو بھی صاف کیا۔ سندر کی چیزوں کو جی جان سے سنبھالنا یہی اس کے پیار کا اظہار تھا اور اُن یادوں میں گم رہنا بس یہی تو اس کے جینے کا سہارا تھا۔

"بے وقوف وِشاکھا!" اس کے منہ سے ایک سسکی نکل گئی اور ایک سسکی نے جیسے دوسری سسکیوں کو بھی مدعو کیا۔ دوسری سسکی، تیسری سسکی، چوتھی اور پانچویں اور ان سسکیوں سے زور زور

کاروناشروع ہو گیا۔ "یہ لڑکی مجھے اپنے پتی کی یادوں سے دور کر رہی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو پتی کی یادوں کی قبر میں دفن کر دیا ہے اور یہ لڑکی مجھے اس قبرستان سے باہر نکالنا چاہتی ہے؟"

موہنی نے اپنے بال ٹھیک کیے۔ سندر کی لائبریری سے باہر نکلی۔ دروازہ بند کر کے باہر سے چپل پہنی، جوتے لائبریری سے باہر رکھنا اور اسے ایک مندر سمجھنا سندر کا قانون تھا اور اس کو ماننا موہنی کی عقیدت تھی۔ یہ کتب خانہ اس کے لیے ایک پاک مندر ہے۔ کتب خانہ سے نکل کر اس نے اس چھوٹے سے باغیچے کے ہر ایک پودے کو پانی دیا، پیاسی لتاؤں کو بھی۔ وشاکھا نے قسم قسم کے پودے اور پھول لا رکھے تھے۔

لو برڈز (love birds) کے پنجرے کو صاف کر کے ان رنگ برنگے پرندوں کو دانا پانی دیا۔ مچھلیوں کے ٹینک کو صاف کر کے وشاکھا کی پالی ہوئی رنگ برنگی مچھلیوں کو کھانا دیا۔ اس کے خرگوش چنکو اور منکو کو گاجر اور گھاس دیا۔ اس کے کچھوے کو اس کی خوراک دے کر اپنے آپ کو پُرسکون محسوس کیا۔ وشاکھا کے پالے ہوئے جانور، پرندے، پودے اس کے بغیر کیسے جی پائیں گے؟

چونک کر اس نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا۔ کھانا پکانا ہے! وشاکھا کے آفس سے ٹفن والا آئے گا، سبزی والے کی آواز سنائی دی۔ دوڑتے، ہانپتے وہ بنگلے کے گیٹ کے باہر آگئی۔ تازی سبزیوں، بھاجیوں کو دیکھ کر اس کا دل کھل اُٹھا۔ وشاکھا کی من پسند سبزیاں خرید کر وہ کچن میں آئی اور دیری کے لیے اپنے آپ کو کوسنے لگی۔

"انسان اتنی ساری یادوں میں کیا تنہائی محسوس کر سکتا ہے؟" لیکن وشاکھا کی جدائی کے صرف خیال سے ہی وہ اپنے رونے پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس کے آنسوؤں کا سیلاب روکے نہیں رک رہا تھا۔ پتی کی اچانک موت کے بعد اس نے وشاکھا میں ہی اپنے آپ کو پورا ڈبو دیا تھا۔ اس کو پالنا پڑھانا، اس کی سہیلی ساتھی بن کر جینا، اس کا کھانا پینا، اس کی ہر پیاری چیز کو پیار کرنا۔

اس سے اس کے پتی کی یاد کے زخم سوکھنے لگے تھے۔ مگر اب جیسے زخموں کے ٹانکے پھر سے کھلنے لگے تھے۔ بٹیا شادی کر کے پردیس جا رہی ہے، یہ قدرت کا نظام ہے لیکن اس اٹوٹ پیار میں غم برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔

دونوں ماں بیٹی کا خیال تھا کہ شادی کرنے کے بعد بھی وشاکھا اسی شہر میں رہے گی مگر محبت کی دیوی نے اپنے رنگ دکھا دیے، وہی ہو رہا تھا جو خدا کو منظور تھا۔ پڑھائی پوری کرنے کے بعد چندر و اور وشاکھا دونوں نے نوکری شروع کر دی مگر چندرو کو بہت بڑی تنخواہ والی نوکری، بنگلہ، کار سب کچھ اس شرط پر مل رہا تھا کہ اسے ویسٹ انڈیز میں تین سال نوکری کرنی ہوگی۔ اس کے بعد شاید کسی اور جگہ پر وہ اپنا تبادلہ کر سکتا تھا۔ چندرو کے رشتے داروں کو اپنے بیٹے کی پسند پسند آگئی، سب کچھ طے ہو گیا تھا۔ بس اب ایک مہینے کے اندر شادی ہونے والی تھی۔

اس نے رسوئی گھر میں آکر دو سبزیاں پکائیں، چاول بنایا، روٹیاں سینک دیں۔ سلاد، دہی، اچار اور پاپڑ ٹفن میں ڈال کر ٹفن ایک چھوٹی سی تھیلی میں ڈالا، جس پر کشیدہ کاری اس نے خود کی تھی۔ ٹفن والے کو ٹفن کا ڈبہ دیتے ہوئے اسے خیال آیا میری بچی بس کچھ دنوں کی مہمان ہے، اس شہر میں اور اس گھر میں بھی۔

یہ گھر جس میں وہ پیدا ہوئی۔ بیٹھنا، کھڑے رہنا، بولنا، چلنا سیکھا۔ ماں کی اُنگلی کا سہارا لے کر، بابل کے کندھوں پر چڑھ کر باغیچے میں لگائے جھولوں پر جھلتے ہوئے ہر سکھ آرام اور اور سہارا پایا۔ اس کے پالے ہوئے جانور، پرندے، پیڑ پودے، جھولا، کھلونے وشاکھا کے بغیر کیا نہیں روئیں گے؟ اس نے اپنے آپ کو بہت خالی خالی ادھورا اکیلا اکیلا سا پایا۔

اسے آج اکیلے روٹی کھانا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ پانی کا ایک گلاس پی کر بے چین دل سے پلنگ کی طرف سونے کے لیے وہ آگے بڑھی۔ اتنے میں دیوار پر ٹنگی ہوئی گھڑی کی آواز سے اسے یاد آیا، یہ تو اس کی سمادھی کا وقت ہے۔

اس کے روزانہ معمولات میں دن میں تین بار سمادھی میں بیٹھنا بھی شامل تھا۔ عموماً صبح، دوپہر اور شام کے وقت وہ اپنے آپ سے ملتی تھی۔ اپنی ذات کا مطالعہ کرتی تھی۔ اپنے آپ کو پہچاننا اور اپنی ذات سے بہت سارے الجھے ہوئے سوالوں کے جواب پانا کتنے سارے فیصلوں کا گہرا مطالعہ کرنا یہ سب اس وقت آسان ہو جاتا تھا۔

سمادھی کے بعد اس کی تناؤ بھری نسوں کو سکون مل گیا۔ اس نے اپنے آپ کو بہت ہلکا ہلکا سا محسوس کیا۔ اس کی تن، من روح میں چیتنا جاگ گئی۔ اُمنگ اور جوش بھر گیا۔ اسے بھوک لگنے

کا احساس ہوا۔ وہ اُٹھی، کھانا کھایا اور پلنگ پر لیٹتے ہی گہری نیند میں سما گئی۔

دروازے کی لگاتار گھنٹی بجنے سے اس کی آنکھ کھل گئی......

وہ اٹھی دروازہ کی طرف بڑھی، دروازہ کھولا، وشاکھا تھی۔ ماں کو گود میں اُٹھا کر گول گول گھما کر کہنے لگی......

"مائی، میا، اَما! کمبھ کرن کی نیند میں تھیں کیا؟ کتنے وقت سے بیل بجا رہی ہوں! کل سے یاد کر کے تالے کی کنجی لے جاؤں گی۔ اری ماں، تمہاری گہری نیند سے تو مجھے حسد ہو رہی ہے۔ نوکری چھوڑنے کے بعد پردیس میں بس جانے کے بعد میں بھی ڈھیر سارا کھانا کھاؤں گی اور سوتی رہوں گی۔ بہت عیش ہی عیش ہو گی میری زندگی میں......"

ٹفن، پرس، دوپٹہ صوفے پر پھینک کر ہرنی کی طرح چھلانگ لگا کر فریش ہونے کے لیے وہ حمام میں غائب ہو گئی۔

موہنی نے واش بیسن میں منہ دھویا۔ بال سنوارے، پاؤڈر کا ہلکا سا لیپ لگایا۔ رسوئی گھر کی طرف بڑھی۔ چائے اور ہلکا ناشتہ بنا کر ٹرے میں رکھ کر بالکنی میں آ کر بیٹھ گئی۔ جہاں پر چھوٹی سی گول تپائی اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

شام کی چائے دونوں مل کے پیتی تھیں۔ اب وشاکھا کے سارے دن بھر کی خبریں شروع ہو جائیں گے اور وہ خاموش سامع بن کر اسے دیکھتی سنتی رہے گی۔ وہ وشاکھا کے ہر رنگ روپ، آسن پر مر مٹتی تھی۔ اس کا کھلکھلانا، غمزدہ ہونا، مسکانا، غصہ، وہ مدہوش ہو کر اس کے سب روپ کو دیکھتی رہتی تھی۔

اس کے دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں کے سامنے، آموں سے بھرا ہوا درخت، گہری وادیوں، جھرنے، برسات کی بوندوں کی چھم چھم، بل کھاتی ہوئی ندیاں سب کچھ اسے وشاکھا میں نظر آتے تھے۔ اس کی ہی کوکھ سے خدا کی تخلیق کی ہوئی ایک عظیم تخلیق اس جنم میں اس کی بٹیا وشاکھا اَلبیلی، چنچل، غمگین، پیار سے بھی پیاری لیکن اب اس سے موہ ختم کرنی ہو گی۔ اجنبی امانت ہے، چند دنوں میں اپنے محبوب کے ساتھ پردیس میں جانے والی پردیسن۔

وہ اپنے نازک دل کو بار بار یاد دلاتی ہی تھی کہ اس کی بیٹی جانے والی ہے۔ اس طرح اپنے

دل کو بھی مضبوط کر رہی تھی۔ دن پرندوں کی طرح اُڑتے جا رہے تھے۔ وشاکھا آندھی کی طرح اُڑتی ہوئی آئی......

"ممی، جلدی چائے پی لو اور جلدی تیار ہو جاؤ۔ آج سے خریداری شروع کر دیں۔ جلدی جلدی بھائی" اس نے چٹکی لیتے ہوئے کہا......

جب وشاکھا بہت لاڈ اور دلار میں ہوتی تھی تو اپنی ماں کو الگ الگ، انوکھے انوکھے الفاظ سے پکارتی تھی۔ جیسے اَمّا۔ ممّا، مملی ممّلی، ممّا چنا، ممری امری، اَمّا۔ اس نے اپنے ہی ایجاد کردہ دنیا بھر کی زبانوں کے الفاظ سے ماں کو پکارتی تھی۔ ماں کی رگ رگ اس کی سریلی باتیں سن کر پرسکون ہو جاتی تھی۔

شادی کی تیاریوں میں دن رات جلدی جلدی بیتنے لگے۔ ایک شام کسی وجہ سے وشاکھا جلدی جلدی گھر سے نکل گئی اور اس کی ڈائری ٹیبل پر ہی رہ گئی۔ اس ڈائری میں ایک فوٹو جھانکتا دِکھائی دے رہا تھا۔

موہنی اپنے آپ کو روک نہ سکی۔ وہ فوٹو نکال لیا۔ ارے! اس کے منہ سے نکل گیا۔ ارے! وہ بدبدانے لگی، یہ تو اَرجن ہے! اَرجن، اَرجن اس کے اسکول سے کالج تک ساتھ میں پڑھنے والا ہم جماعت!

ہاں! شادی سے پہلے موہنی اور اَرجن کا بہت گہرا پیار تھا۔ پیار کا یہ بیج بچپن سے ہی اسکول کے دنوں سے بویا ہوا تھا۔ جس کا احساس کالج میں ساتھ ساتھ پڑھتے ہوئے ہوا لیکن وہ پیار شادی کے منڈپ تک پہنچ نہیں پایا۔ ارجن کی ماں نے اپنی سہیلی کی بیٹی سے اس کی شادی طے کر دی تھی۔ ارجن اپنی ماں کا فیصلہ نہیں مانتا تو اس کی ماں خودکشی کر لیتی۔ ارجن کی ماں کا فیصلہ جیسے پتھر کی لکیر تھا۔ یہ فیصلہ دو سہیلیوں اور دو خاندانوں کا ملا جلا فیصلہ تھا۔ ارجن اپنی ماں کی ضد اور دباؤ سے مجبور ہو گیا۔ موہنی نے دل پر پتھر رکھ لیا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے وداع لی اور الگ الگ شریک حیات سے شادی کر لی۔

شادی کے بعد دونوں نے ایک دوسرے سے ذرا بھی میل جول نہیں رکھا۔ دونوں ایمانداری سے اپنا اپنا گھریلو فریضہ ادا کرنے میں مصروف ہو گئے اور اپنا اپنا فرض بڑی ذمہ داری سے ادا کیا۔

موہنی نے وہ ڈائری جس میں ارجن کے پیار کی تفصیل تھی، اس کی ہر ایک چٹھی، فوٹو، تحفہ، یادیں سب جمع کر کے آگ میں جلا دی تھیں اور صاف پاکیزہ دل اور جسم سے سندر کے ساتھ سات پھیروں کے بعد تن من روح سے اپنے آپ کو اسے سونپ دیا تھا۔

دروازے کی گھنٹی بجی، اس نے دروازہ کھولا۔ وشاکھا تھی......

"ممی میری ڈائری، اس میں ایک فوٹو تھا۔ اوہو! یہ تو، تمہارے ہاتھ میں ہی ہے۔ ممی میں نے انہی جناب کے بارے میں اس دن تم سے بات چیت کی تھی۔ انہی کا اشتہار اخبار میں پڑھ کر تمہیں سنایا تھا۔ اندر آؤ...... آرام سے بیٹھو۔ میں ان جناب سے مل کر آئی ہوں اور ان کا فوٹو بھی لے آئی ہوں"۔

میں نے جب انھیں تمہارا فوٹو دیا تو وہ متعجب ہو گئے اور کہنے لگے "بیٹا، عجیب اتفاق ہے، میں تمہاری ممی سے واقف ہوں۔ لگ بھگ چوبیس پچیس سال بچھڑ کر ہو گئے...... اور انھوں نے ساری باتیں تفصیل سے مجھے سنائی"۔

"میں نے چندرو سے بھی ساری باتیں کر کے بتا دی ہے۔ وہ بھی میرے فیصلے سے متفق ہیں۔ صرف تمہاری ہاں کی ضرورت ہے"۔

موہنی بالکل خاموش ہو گئی۔ جیسے کوئی بہری ہو گئی تھی۔ گھر کے دروازے کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔ وشاکھا نے دروازہ کھولا...... شادی میں شامل ہونے کے لیے مہمان آئے ہوئے تھے۔ ارے! شادی میں تو دو چار دن ہی باقی رہ گئے تھے۔

مہمانوں کا استقبال موہنی اور وشاکھا نے مل کر کیا۔ فون کی گھنٹی بجنے لگی...... فون چندرو کا تھا۔ سسرال والے بھی بنگلور سے آ گئے تھے اور ایک اچھے ہوٹل میں رہ رہے تھے۔ چندرو نے موہنی سے شرارتی آواز میں پوچھا۔

"ممی دونوں شادیاں ایک ہی منڈپ میں ہو گی یا اور کوئی ارادہ ہے"۔

موہنی جب تک کوئی جواب دے چندرو نے فون رکھ دیا۔

چندرو اور وشاکھا نے مل کر شادی کی تیاری میں کوئی کمی نہیں ہونے دی۔ مہمانوں کا استقبال، مہندی، موسیقی، ناچ گانا...... کسی کو سر کھجانے کی بھی فرصت نہ تھی۔

موہنی نے کسی طرح اپنے آپ کو تنہا پانے کی کوشش کی۔ کچھ لمحے لائبریری میں جاکر اندر سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ پرسکون انداز میں ایک جگہ پر بیٹھ گئی اور سمادھی میں سما گئی۔ اس کے جسم کی نسیں ڈھیلی ہوتی گئیں اور اس کے نفس سے بہت سارے پریشان کرنے والے سوالوں کے جواب ملنے لگے۔ وہ ہلکی اور پرسکون ہو گئی۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا......

"موہنی، موہنی تمہارا فون آیا ہے!"

اس نے اپنی بند آنکھیں کھولیں۔ چہرہ پر ہاتھ گھمایا، اور دھیرے دھیرے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سمادھی سے چونک کر اچانک جلدی باہر نہیں نکلتے، ایسا کرنے سے سارا جسم کانپ جاتا ہے اور انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس نے سمادھی کے تمام قوانین پورے کیے اور پھر دروازہ کھولا۔ فون اُٹھایا......

ارے! یہ آواز تو جانی پہچانی ہے۔ برسوں نہیں صدیوں کے بعد سن رہی ہوں۔ وہ ایک انجانی دلچسپی میں ڈوب گئی اور چپ چاپ اس کو سنتی رہی۔ بے خودی میں اس کے منہ سے کچھ الفاظ نکل گئے......

"ارجن مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔ ٹھیک ہے تم وشاکھا اور چندرو سے بات کرو۔ مجھے تمہاری بات ٹھیک لگ رہی ہے۔ فون رکھ دوں"۔

دس پندرہ منٹ کے بعد وشاکھا ممی کے پاس آئی۔

"ممی جلدی تیار ہو جاؤ، چندرو کو فون کر دیا ہے۔ سب لوگ وہاں پر آ پہنچیں گے۔ فوٹوگرافر کو بھی بلایا ہے۔ جلدی چلو......"

اور ایک دو گھنٹوں کے بعد موہنی قانونی طریقے سے رجسٹرار کے سامنے 'موہنی سندر منسکھانی' سے 'موہنی ارجن دادلانی' بن گئی۔ بہت خاموش ماحول میں دو چار لوگوں کے سامنے ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ گھر آکر سب وشاکھا کی شادی کی تیاریوں میں جٹ گئے۔

کبھی کبھی کچھ واقعات پلک جھپکتے ہو جاتی ہیں کہ انسان دانتوں تلے اُنگلی دبا کر خدا کے کرشمے دیکھتا رہ جاتا ہے۔ حیران ہوتا جاتا ہے۔

"واہ! واہ! ارے رنگی تیرے رنگ"!

شادی کے سجائے ہوئے منڈپ میں شہنائیاں بجنے لگیں اور ماحول میں شادی کے پاک الفاظ گونجنے لگے۔ سات چکر پورے ہوئے۔ وشاکھا اور چندرو پتی پتنی بن گئے۔ پنڈت نے پوچھا

"بھائی! کنیادان کون کرے گا؟"

چندرو نے پنڈت کے ہاتھ سے مائک لے کر کہا......

"مسٹر ارجن داد لانی کنیا کے والد ہیں۔ وہ ہی اپنی بیٹی کا کنیادان کریں گے"۔

وشاکھا نے ماں کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا......

"اور محترمہ موہنی داد لانی میری ماں!"

دونوں نے مل کر کنیادان کیا۔ شادی منڈپ میں تھوڑے وقت کے لیے کھسر پھسر ہوئی۔ پھر مبارکبادی کی آوازیں گونجنے لگیں۔ وشاکھا نے مطمئن ہو کر سکون بھری سانس لی اور ماں کی طرف ممتا بھری نظروں سے دیکھنے لگی، جیسے کہہ رہی تھی......

"مما دیکھو کیا نہ میں نے تمہارا- کنیادان! اب میں بے فکر ہو کر بیرون ملک چلی جاؤں گی۔ یادوں کی قبر میں تمھیں زندہ دفنانا میری روح نے نہیں قبولا"۔



ایک بدحواس پل

"اس بار میرا فیصلہ پکا ہے۔ بس اب ہم دونوں کو ملنا چاہیے۔ تم اور میں ایک لمبے عرصے سے چاہتے ہوئے بھی ملے نہیں ہیں۔ اپنی پاک محبت کی قربانی دیدی ہے۔ تم اپنی اور میں اپنی نجی زندگی میں پوری ایمانداری کے ساتھ مصروف ہو گئے۔

میں اپنی نوکری میں، گھر گرہستی کی ذمہ داریوں میں اُلجھا، ماں اور بابو جی کی خدمت کرتے ہوئے۔ میرے بچے بڑے ہو گئے۔ پڑھ لکھ کر پیروں پر کھڑے ہو گئے۔ ان کی شادیاں ہو گئیں۔ تم بھی اپنی ذمہ داریوں سے آزاد ہو گئی ہو، تمہارے بچے بھی بڑے ہو گئے ہیں، ان کی شادیاں بھی ہو گئی ہیں۔ بس منجو اب بہت کچھ ہو گیا۔ اب کچھ پل زندگی کے ساتھ رہ کر گزاریں"۔

اس نے خط ختم کیا۔ لفافے میں ڈالا، اس پر پیپر ویٹ رکھا۔ لیکن لفافے کو بند نہیں کیا کیونکہ گوند کی بوتل اسے نہیں ملی۔ اور ٹہلنے کے لیے اوپر برآمدے میں چلا گیا۔

آسمان میں پورا چاند چمک رہا تھا۔ بادلوں سے لکا چھپی کھیل کھیلنے لگا اور وہ تاروں کو دیکھنے لگا۔ ستارے اسے بہت پیارے اور اپنے اپنے سے لگنے لگے۔ وہ بچپن سے ہی تاروں کو گھنٹوں دیکھتا رہتا تھا۔ ماں اسے تھپکیاں دیتے ہوئے کہتی تھی "چھورا! سو جاؤ۔ ساری ساری رات آسمان میں آنکھیں اٹکائے جاگتا رہتا ہے۔ کیا ہے اس آسمان میں اور ان تاروں میں؟"

"اَمّا! مجھے چاند، تارے، بادل بہت ہی اچھے لگتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے نیلگوں آسماں کو نہارتا ہی رہے۔ بادلوں کے الگ الگ رنگ روپ دیکھتا ہی رہوں۔ خرگوش، ہاتھی سارے جانور، پنچھی، پیڑ، مختلف قسم کے ہیولے تصوّر کرو، ویسا بادلوں کو روپ لیتا بھی دیکھتا رہوں۔ اور تاروں کی خوبصورتی کو تاکتا ہی رہوں"۔

"پگلا، دیوانہ......" ماں نے گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔ کچھ وقت وہ تاروں کی آنکھ مچولی دیکھتا رہا اور ٹہلتا رہا۔ اسے یاد آنے لگا معصوم منجو کا مکھڑا اور اس کی آواز۔ "منوہر، تارا ٹوٹ کر گرا لیکن میں اپنی آنچل کی گانٹھ باندھ نہ سکی اور اپنی آرزو یا دعا مانگ نہیں پائی۔ منوہر، ہر بار میرے ہی ساتھ ایسا کیوں ہوتا رہتا ہے؟ لوگ کہتے ہیں، تارے ٹوٹنے کے وقت جو دعا ہم کرتے ہیں وہ ضرور پوری ہوتی ہے۔ میں پگلی، پھٹی ہوئی آنکھوں سے ٹوٹتے ہوئے تارے کو دیکھتی ہی رہ جاتی ہوں اور وہ میری آنکھوں کے سامنے ٹوٹ کر غائب بھی ہو جاتا ہے۔ منو، کیا اسی طرح ہم دونوں آپس میں مل نہیں پائیں گے؟ کیا ہماری پاک محبت شادی کے بندھن اور منڈپ تک پہنچ نہیں پائے گی؟"

"منجو! تارے، ستارے، کائنات، قسمت ان سب میں میرا پورا بھروسہ ہے۔ شادی ایک تقدیر کی بات ہے۔ ودھاتا کا لکھا ہوا نصیب ہے۔ اس بات پر میرا یقین ہے اور اگر دو محبت کرنے والے شادی کے بندھن میں نہیں بندھیں گے تو نصیب الگ الگ رکاوٹیں ڈالتا رہے گا"۔

اس نے اس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "منجو، دیکھو تمہارے والدین اپنے دھندے میں شامل کیے ہوئے شخص کے بیٹے سے تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے وعدہ کیا ہوا ہے۔ دونوں خاندانوں کے لوگ ایک دوسرے کے گہرے دوست ہیں۔ انھیں کوئی نوکری کرنے والا داماد نہیں چاہیے۔ اپنا دھندہ کرنے والا، امیر، آرام پسند لڑکا انھیں اچھا لگتا ہے۔ تمہارے والد نے میرے ساتھ شادی کرنے کے لیے منع کر دیا ہے"۔

منجو نے منوہر کے شرٹ کا کالر ٹھیک کرتے ہوئے کہا "نہ صرف منع کر دیا ہے، ڈیڈی نے تو خودکشی کرنے کی دھمکی بھی دی ہے۔ تم ہی بتاؤ منوہر میں کیا کروں؟ میں والدین کی خواہش کے خلاف کوئی بھی قدم اُٹھانے سے معذور ہوں۔ میں ان کا دل توڑ نہیں سکتی۔ مجھے معاف کر دینا منو! زندگی میں میں نے پہلی بار تمہارے ساتھ پیار کیا ہے۔ اور تم سے ہی پیار کرتی رہوں گی۔ بس بے جان مورتی کی طرح گھر گرہستی کی ذمہ داری نبھاتی رہوں گی۔ ایک مشین کی طرح جس میں دل کی دھڑکن نہیں ہوتی۔ شاید! کسی صحیح وقت پر ٹوٹتے ہوئے تارے کو دیکھ کر اپنے آنچل میں گانٹھ باندھ کر اپنی دعا دہرا سکوں"۔

چیکتے، روتے، سسکتے اس نے مجھ سے وداع لی اور مجھ سے الگ ہو گئی......ایک عہد لے کر مجھ سے کہ "مجھے بھی فوراً ہی شادی کرنی پڑے گی کسی اور لڑکی کے ساتھ اور ایک دوسرے کے خاندان میں نیز خانگی زندگی میں ہم کوئی رکاوٹ یا روڑا نہیں ڈالیں گے۔ ہماری گھریلو زندگی ایک جدوجہد ہو گی، ہمارا پیار ایک عبادت......!"

تن من سے اُن دونوں نے اس عہد کو نبھایا۔ آج کیا ہو گیا ہے؟ منجو کی یاد بہت ستا رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے، اس کے بغیر ایک لمحہ بھی بتانا مشکل ہو رہا ہے۔ گھڑی میں وقت دیکھا، وہ بہت دیر سے چھت پر ٹہل رہا تھا۔ اسے کچھ یاد آیا۔ وہ زور زور سے قہقہے لگا کر ہنس پڑا۔ آج منجو نے ٹوٹتے ہوئے تارے کو دیکھ کر اپنی ادھوری دعا پوری کرنے کے لیے تو نہیں مانگا ہے کہ منوہر سے ملوں؟......وہ ایک بار پھر زور سے ہنس پڑا اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

اس کا منجو کے نام پر لکھا ہوا خط لفافے سے باہر پلنگ پر پڑا تھا۔ اس کے سرہانے دودھ کا گلاس ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ وہ سوچنے لگا مدھو اس کی بیوی کمرے میں آ کے گئی ہے۔ یہ محبت نامہ پڑھ کر دودھ کا گلاس رکھ گئی ہے۔ اسے میری جوانی کے پیار کی خبر لگ گئی ہے......

اس پر کیا بیتی ہو گی؟ اُف! وہ کیا سوچتی ہو گی میرے اور منجو کے بارے میں......؟ ایک آوارہ بنجارہ خیال مجھے عملی دنیا سے کتنا دور لے گیا۔ ایک لمحہ کے بہکانے والے خیال نے ہم تینوں ...... نہیں نہیں...... ہم چاروں...... دو جوڑوں کی زندگی کو پریشان کر گئے۔

جس حادثے، جس پیار کے واقعہ کو قریب قریب پچیس سال ہو گئے ہیں، اسے ماضی کے ایک گزرے ہوئے لمحہ کو پکڑ کر اپنی بیوی کو ایک چنچل بچے کی طرح دکھ دے دیا۔ اس بے چاری نے تن من سے میری خدمت کی، مجھے اپنا ساتھ اور سہارا دیا۔ اس کے کسی جذبے کو دکھانے کا حق میں نے کہاں سے پا لیا؟ اس کا کیا قصور؟

یہ صحیح ہے کہ منجو سے میں پیار کرتا تھا، کرتا ہوں۔ اس کی میٹھی دلچسپ یاد آنا یہ قدرتی ہے، پاک بھی ہے لیکن ان جذبات کو کسی کاغذ پر اُتارنا ایسی بے وقوفی مجھے نہیں کرنی چاہیے تھی۔

وہ سوچنے لگا، اگر یہ خط منجو کے پتی، کسی جوان بیٹے یا بہو کے ہاتھ میں آ جاتا تو اس کا خاندان تنکا تنکا ہو جاتا۔ پیار کرنا گناہ نہیں ہے لیکن اس کا اظہار اس ڈھلتی ہوئی عمر میں کرنا، ضرور گناہ ہے۔

اس کا گھر، جو اس نے برسوں کی ریاضت کے بعد بنایا ہے، اس جدوجہد میں رکاوٹ ڈالنا غلط ہے۔ پیار کا احساس ہے، بہت اونچا، شاندار، پاک جذبہ ہے۔ پیار کرنے والے کا دل ایک مندر ہے۔ جس انسان نے پیار نہیں کیا وہ سوکھے درخت کے مانند ہے، ایک بے جان مشین۔ وہ کسے پیار دے بھی نہیں سکے گا، جسے پیار ملا نہیں ہے حاصل نہیں ہوا ہے وہ انسان نامکمل ہے، محروم ہے۔

ماں آئی۔ "ارے اندھیرے میں بیٹھا ہوا کیا کر رہا ہے؟ بتی جلادوں......؟"

منوہر کے سوچوں کا تانا بانا بکھر گیا۔ "تارے گن رہا ہوں ماں، چاند کی روشنی بہت اچھی لگ رہی ہے آنکھوں کو" ...... "اچھا پندرہ بیس منٹ کے بعد پوجا گھر میں آجانا، آرتی جو کرنی ہے، میں اوپر آئی تھی" ...... "اچھا ماں ......" ماں چلی گئی۔

اس کے سوچوں کا سلسلہ پھر سے جڑ گیا۔ وہ کسی سحر میں کھوتا چلا گیا۔ خدا کو بھی وہی انسان پیار کر سکے گا جو خود کسی کے پیار میں پوری طرح بھیگا ہوا ہو، مدہوش، سحر زدہ، رادھا، میرا، شاہ کا نائیک، نائیکا جسمانی طور پر نہیں ملے، کیا ان کا پیار سچا نہیں تھا؟ انھوں نے پیار کو رسوا نہیں کیا...... میں یہ کیا کر رہا ہوں؟ کیا کر ڈالا میں نے؟

منوہر کا ضمیر اسے کوسنے لگا۔ اس کا دل اسے ملامت کرنے لگا۔ اس نے منجو کے خط کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا اور دودھ کا گلاس ہونٹوں کو لگا دیا۔

ایک دھکا لگا اس کے ہاتھوں کو...... اس ہاتھ میں تھامے گلاس کو۔ دودھ فرش پر گر کر پھیل گیا۔ گلاس کو دھکا مارنے والی مدھو ہی تھی۔ گلاس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی ...... اس نے مدھو کی آنکھوں میں دیکھا ...... بے انتہا محبت اور ڈر بھرا ہوا تھا ان آنکھوں میں ...... مدھو نے اسے بانہوں میں بھر لیا اور پھسپھسائی ......

"جانِ من! سب بھول جاؤ۔ فرش پر گرا ہوا دودھ بٹورنے سے کیا فائدہ؟ ماضی ماضی ہی ہوتا ہے، ہر گزرا لمحہ ماضی بن جاتا ہے۔ حال سے اسے کیوں جوڑیں؟ آؤ سب بھول جائیں......"

دونوں کی نگاہوں نے ایک ساتھ ایک لمحہ میں دیکھا، کہیں سے ایک بلّی آئی، فرش پر پھیلا دودھ چاٹنے لگی اور تڑپنے لگی...... دیکھتے ہی دیکھتے وہ مر گئی...... زہر نے اثر دکھایا۔

فرش پر کانچ، دودھ، مری ہوئی بلّی اور محض چند کاغذ کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے!



دو عورتیں

ایروڈا جیل میں وارڈن ہونے کے دوران بہت ساری قیدی عورتوں کے چہرے آنکھوں کے سامنے گھوم رہے ہیں۔

پاروتی نے پتی کا خون کر دیا، عمر قید کی سزا، ماتھے پر بڑا سا تلک...... چہرہ روشن، چکّی پیسنا، سارے سخت کام کرنا، کسی بھی پہلو سے قاتل، خوفناک، ڈراؤنی نہیں لگتی تھی۔ میں اُن سے چھوٹی تھی۔ پاروتی دیدی کا بارونق، شانت چہرہ۔ اس کی باوقار چال ڈھال مجھے بہت پسند تھی۔ میں اکثر اس کے آس پاس منڈراتی رہتی۔ ایک قاتلہ جس نے اپنے پتی کا خون کر دیا، وہ ڈراؤنی، خوفناک، پاگل پن، وحشی پن سے بھری ہوئی کیوں نہیں؟ تجسس سے میرے قدم اس کی اور بڑھتے رہے۔

میں زیادہ سے زیادہ اُنھیں جاننا چاہتی تھی۔ بچپن سے ہی ایک عادت سی پڑ گئی ہے مجھ میں ......اپنے کردار کے آس پاس منڈراتی رہتی ہوں۔ جب تک میں پوری طرح سے جان نہ لوں...... اور پھر لکھ نہ دوں چین نہیں آتا مجھے۔ اکثر میں زیادہ سے زیادہ اپنے کرداروں سے ملتی رہتی ہوں، یہ بات غیر ارادی ہوتی ہے یا جان بوجھ کر؟ ہر وقت ایسا ہی ہوتا رہتا ہے میرے ساتھ!

چنانچہ پاروتی دیدی کے آس پاس منڈراتی رہتی تھی۔ دیگر خاتون قیدیوں کے مقابلے میں ان کا باوقار چہرہ دیکھ کر، معصومیت اور بے گناہی کے جذبات سے بھرا ہوا چہرہ، سانولا سانولا سا روپ، بڑی بڑی بے گناہ آنکھیں کھینچ لیتی تھیں مجھے۔

دیدی نے چکّی میں دس کیلو اناج پیس لیا تھا۔ چکّی کی رے رے کی آواز ماحول میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ میں آگے بڑھی، پسے ہوئے آٹے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھ ڈالا 'دیدی! آپ سے قتل کیسے ہو گیا؟ جھوٹا الزام کیسے لگا؟ کس نے لگایا؟ یہ سازش آپ سے کس نے کی؟' ساڑی

کے پلّو سے پسینہ پونچھتے ہوئے پاروتی دیدی نے کہا"الزام؟ نہیں، میم صاحب! یہ سچ ہے کہ میں نے اپنے پتی کا قتل کیا ہے"۔

میں وارڈن تھی اس لیے اس حساب سے چھوٹی عمر میں بھی اسٹاف اور قیدیوں کی نظر میں 'میم صاحب' کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ میں نے اسے ٹوکتے ہوئے بیچ میں ہی کہا'میم صاحب نہیں مجھے میرے نام سے ہی پکار سکتی ہو پاروتی دیدی'۔

اس نے میرے ہی نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا" یہ سچ ہے میں نے اپنے پتی کا قتل کیا "۔اس کی آواز میں ذری بھی کپکپاہٹ، شرم، پچھتاوا نہیں تھا۔

میں نے متعجب ہو کر کہا" آپ نے اپنے ہوش حواس میں پتی کا قتل کر دیا؟"

"ہاں!"

اتنے میں سائرن بجا۔ کھانا کھانے کی اطلاع۔ میں اور پاروتی دیدی چونک کر اُٹھ گئیں۔ کھانے کی بڑی لمبی قطار لگتی تھی۔ پھر کھانا پروسنے کی مقدار دھیرے دھیرے کم ہو جاتی تھی۔ اس لیے ساری خاتون قیدی لگ بھگ دوڑ کر جلدی ہی قطار میں شامل ہونے کی کوشش کرتی تھیں۔ سو پاروتی دیدی قطار میں شامل ہو گئی۔ میں اپنے دفتر میں اپنا لنچ کھانے چلی گئی۔

اتنے میں چیخنے لڑنے کی آوازوں نے چونکا دیا۔ دو خاتون کانسٹبل ایک لڑکی کو پکڑ کے لا رہی تھی۔ وہ لڑکی صندلی رنگ کی، درمیانہ قد، وحشت اور دہشت سے بھری آنکھیں۔ منہ سے تھوڑا سا جھاگ بہہ رہا تھا۔ اونچی اونچی آواز میں چلا رہی تھی 'مار ڈالوں گی، میں سب کو مار ڈالوں گی'۔ وہ خاتون کانسٹبل سے اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ وہ نڈھال ہو رہی تھی۔ اس کی سلک کی ہری ساڑی کا پلّو بار بار کندھے سے پھسل کر دھول میں میلا ہو رہا تھا۔ بلاؤز کے ایک دو ہک ٹوٹے تھے، گلے اور چھاتی کے حصے جو دِکھائی دے رہے تھے ان پر ناخنوں کے نشان بھی صاف دِکھائی دے رہے تھے۔

ایک خاتون کانسٹبل نے کیس پیپر میرے آگے بڑھا دیا۔ میں نے پہلے اس کا نام، جو مالتی تھی، اور جرم والا کالم پڑھا۔ ماں کے خون کرنے کے جرم میں گرفتار ...... میں چونک گئی۔ کانپ بھی اُٹھی۔ پھر اپنے آپ کو کچھ دیر میں پرسکون کر کے میں نے اسپتال کے ڈاکٹر کو فون کیا۔ "قیدی بہت

نفسیاتی، جسمانی زخموں سے نڈھال ہے۔ آپ دودونوں کیلئے اسے آرام اور پیٹ بھر کھانا کھلائیں"۔
میں نے ایروڈا جیل کی لیڈی سینئر سے بھی بات چیت کرلی۔ کچھ عرصے میں سب کارروائی ہوگئی...... جیل میں خاموشی تھی۔ تھوڑا وقت آرام کا تھا۔ میری نظر اُدھ کھلے ٹفن پر گئی۔ بھوک کا احساس جاگا، کھانا کھانے بیٹھ گئی۔
جیل میں ساڑھے سات تک میں خاتون قیدیوں کی کیس ہسٹری پڑھتی رہی، پھر اپنے گھر کے لیے روانہ ہوگئی۔ وارڈن ہوتے ہوئے بھی مجھے اپنے پریوار سے اجازت نہیں ملی تھی کہ میں جیل سے ملے ہوئے اپنے کوارٹر میں رہوں۔ جیل والے چاہتے تھے میں وہاں پر ہی رہوں۔ اُن دنوں گھر کے لوگ اس بات کو گلے نہیں اُتار پائے کہ لڑکی اپنا گھر چھوڑ کر کہیں اور رہے۔ وہ تو سخت ناراض تھے کہ میں نے ایسی نوکری کیوں قبول کی جہاں گناہوں سے بھری عورتیں تھیں جو قتل کرتی ہیں، جو چور، ڈکیت وغیرہ ہیں۔ ماں کہتی تھی ان کی صحت کا اثر مجھ پر پڑ جائے گا۔ گھر جانے میں تھوڑی دیر ہو جاتی تو بار بار ماں یا بھابھی کا فون آنے لگتا۔ کہیں مجھے کچھ ہو تو نہیں گیا۔ ایروڈا جیل کے مہیلا وِبھاگ کی وارڈن کی نوکری، اس وقت تو میرے گھریلو ماحول کے مقابلے میں چنوتی سی تھی۔
اکثر بڑے بھیا سر پر ہلکی چپت لگا کر کہتے 'سر پھری لڑکی'!
گھر آکر اگر بتی لگائی۔ اگر بتی کی خوشبو سے گھر کا ماحول سہانا ہوگیا۔ آرتی شروع کی۔ ماں، بھابھی، خالہ بھی آرتی میں شامل ہوگئیں۔ شعور میں اُبھرے ہوئے تمام واقعات کافور ہوگئے۔ پریوار کے ساتھ کھانا کھا کر، ماں سے لپٹ کر میں بے فکر نیند سوگئی۔
صبح پھر وہی میں، وہی جیل کی دیواریں اور خاتون قیدی۔ نفسیاتی مطالعہ کا شوق ہونے کی وجہ سے میں نے یہ نوکری قبول کی تھی۔ کسی بدحواس پل میں خون کرنی والی عورتیں، کچھ ظلم نہ سہنے والی عورتیں، کچھ بالکل چپ چاپ، کچھ گھر جاکر اپنے بچوں سے ملنے کو بے چین، کسی کو گھر جانے کی کوئی خواہش نہیں، کوئی اپنی کرنی کو کوستی ہوئی، کچھ روتی بلکتی، سسکتی عورتیں...... تمام عورتوں کے چہرے، قد، گھریلو ماحول مع فوٹو میری کیس ہسٹری فائل میں بند۔ جو میں اکثر بار بار پڑھتی رہتی تھی۔ آفس کے ضروری کام نمٹا کر میں راؤنڈ کے لیے چل پڑی جو میری ڈیوٹی میں

شامل تھا۔ پاروتی دیدی کے پاس پہنچی، ماتھے پر بڑا سا ٹیکا، صاف دھلی سفید سوتی کی ساڑی، جس پر نیلے رنگ کا بارڈر تھا۔ وہ چرخہ کات رہی تھی۔ پوری طرح جی لگا کر۔ میرے کھنکھارنے سے گردن اوپر کر کے میری طرف دیکھا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گئی، کسی مندر میں بیٹھنے جیسی شانتی حاصل ہوئی۔ "پاروتی دیدی آپ نے اپنے پتی کا خون کیوں کر دیا؟ اور تمھیں اس بات پر پچھتاوا یا ملامت کیوں نہیں؟" کام کرنے والے اس کے ہاتھ میرے سوال سے رک گئے۔

"سننا ہی چاہتی ہیں میڈم تو سن لو! لیکن میں اس کی وجہ صرف تمھیں ہی بتاتی ہوں، جو کورٹ میں یا کسی وکیل کو بھی نہیں بتایا ہے۔

میرا پتی جنسی جذبات سے اتنا مغلوب کہ ایک وحشی بھیڑیا ہی تھا۔ جو شادی کی رات کو ہی کچھ کچھ جان گئی تھی۔ صرف مجھ سے ہی ان کی جسمانی خواہش شانت نہیں ہوتی تھی۔ یہ بات دھیرے دھیرے شادی کے پانچ سال کے اندر میں جانتی گئی۔

اچھا خاصہ کماتے تھے۔ ساس سسر، نند، دیور، سب بھلے تھے...... میں نے سوچا چلو اِن میں ایک برا انسان ہے۔ شاید میرے پیار، خدمت، بھروسہ سے دور ہو ہی جائے گا۔ میں پانچ سالوں میں دو بچوں کی ماں بن گئی۔ لڑکی بڑی تھی جانکی اور لڑکا کشن۔

بیچ بیچ میں میرے پتی کی جنسی کارستانیاں میرے کانوں میں پڑتی رہتی تھی۔ ایک بار تو جب میں گھر میں اکیلی تھی، ایک اور عورت کے ساتھ آیا تھا۔ رسوئی گھر کی کڑی لگا دی، میں اندر ہی رہی۔ بعد میں میں جھگڑتی رہی، روتی رہی۔ بچے بڑے ہوتے رہے۔ میں نے پورا دھیان بچوں کی پرورش و تربیت اور پڑھائی پر ہی مرکوز کر دیا تھا۔

یہ اس دن کی بات ہے۔ ساس سسر سفر پر گئے ہوئے تھے۔ کشن اپنے کاکا کے پاس گیا تھا۔ میں اپنے ممیرے بھائی کے لڑکے کی سالگرہ کی دعوت سے لوٹی تھی۔ گھر میں سے زور زور سے چلانے کی آوازیں، ٹوٹنے پھوٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں...... دروازہ بند تھا، لیکن پرانا تھا اور کری کمزور تھی۔ زور سے کرسی کا وار کرنے سے دروازہ کھل گیا۔ میرا پتی، جانکی کا باپ، اپنی بیٹی سے بد فعلی کر رہا تھا۔ جانکی چلا رہی تھی ماں! ماں! بچاؤ۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پاس میں رکھی ہانسیا سے اس شہوت کے کیڑے کو مار ڈالا۔

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میرے ہاتھ میں ایک لفافہ تھمایا۔ میں نے کھولا، اس میں اس کی بیٹی کا اپنے پتی اور بچے کا فوٹو تھا۔ اور خط، جس میں یہ لکھا تھا، "ماں، مجھ جیسی اپنے ہی باپ کی وحشت کا شکار بنی ہوئی لڑکی کا خالہ کی مدد سے شادی کروا کے، پڑھے لکھے شخص سے شادی کروادیا۔ تمہارے لیے میری عقیدت بڑھ گئی ہے"۔

پارو دیدی کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا تھا۔ پھپک پھپک کر کندھوں پر سر ٹکا کر رونے لگی۔ مٹکے میں سے پانی کا گلاس بھر کر میں نے اسے پلایا۔ اسے تھپتھپایا، سہلایا، اسے سلایا اور کہا تھوڑا آرام کرلو بہن۔

دل ہی دل میں مَیں نے اسے پرنام کیا۔

کسی کے قدموں کی آہٹ نے میرا دھیان بھنگ کردیا۔ میں نے دیکھا سفید شرٹ، پتلون، کالے چمچماتے جوتے پہنے ہوئے ایک وارڈ بوائے 'گنگا' جس کا پورا نام گنگا رام تھا، سانولا رنگ، قد اونچا، مونچھیں بڑی بڑی، خوبصورت آنکھیں، بھورے رنگ کی، اس کے دانت کے گوشت والا حصہ اور ہونٹ تھوڑے کالے تھے۔ اس سے محسوس ہوتا تھا وہ ہم لوگوں سے چھپ کر تمباکو کھاتا رہتا ہوگا۔ وہ میرے پاس جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا آ پہنچا اور کہنے لگا 'میم صاحب! وہ لڑکی اب ٹھیک ہے۔ مہیلا پولیس آپ کو بلانا چاہتی ہے'۔ میں اُس طرف لپک لی۔

وہ لڑکی ہوش میں آگئی تھی، مجھے آتا دیکھ کر بس! یوں ہی ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "مالتی، کیسی طبیعت ہے؟" "ٹھیک ہے!" میں نے دو مہیلا پولیس والوں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا "آپ لوگ باہر جا کر کھڑی رہیں"۔ میں نے مالتی کی کلائیوں کو سہلایا، ٹیبل پر رکھا ہوا مرہم لگانے لگی۔ گلوکوز کی نالیوں سے کلائی کی نسیں پھول گئی تھیں۔ ہاتھوں کا سہارا دے کر اسے بٹھادیا۔ دودھ کا گلاس اُٹھا کر اسے دھیرے دھیرے پلانے لگی۔

دودھ پیتے پیتے اچانک مالتی سسکنے لگی، "دیدی! میں ویسی نہیں ہوں!" میں نے اپنائیت بھرے لہجے میں پوچھا "کیسی؟" "قاتل، خوفناک، سب کا خون کرنے والی وغیرہ وغیرہ...... آپ سمجھ رہی ہیں دیدی، میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں؟" مالتی نے کہا۔

"ہاں! پھر اپنی ماں کا خون کیوں کردیا؟ کیا یہ تم پر ایک جھوٹا الزام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، میں نے اسے مار ڈالا" اس نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیوں مار ڈالا؟ کیا تم مجھے بتاؤ گی؟"

"دیدی! میں کالج میں پڑھتی ہوں۔ اسکول میں ہمیشہ پہلا نمبر آیا کرتا تھا۔ مجھے پڑھ لکھ کر معلّمہ بننا تھا۔ ایک پڑھا لکھا، نوکری والا پتی اور چھوٹے پیارے بچے...... ایسا مقصد تھا، میری زندگی کا، میرے پتاجی کا بھی یہی خواب تھا۔

پتاجی کے انتقال کے بعد ماں کا رویہ اور برتاؤ بدلنے لگا تھا، نہ جانے کیوں؟"

اتنے میں ایک نرس آگئی اور مجھ سے کہا "میڈم، اب مریض کو نیند کا انجکشن لگانا ہے، اسے آرام کی سخت ضرورت ہے"۔ میں کمرے سے باہر نکل آئی۔

کچھ دنوں کے علاج کے بعد مالتی ٹھیک ہو کر جیل کے وارڈ میں داخل کی گئی...... میں اکثر اس کے بارے میں ہی سوچتی رہتی تھی۔

ایسے ہی ایک دن میں آفس میں بیٹھی کچھ فائلز پڑھ رہی تھی کہ ایک مہیلا پولیس والی نے آکر کہا "قیدی نمبر 226 یعنی مالتی کھانا کھانے سے انکار کر رہی ہے، اور بار بار چلا رہی ہے، میں اسے مار ڈالوں گی۔ آپ جاکر اسے سمجھائیے۔ میں جلدی جلدی اپنے ہاتھ کا کام نمٹا کر مالتی کی طرف بڑھی۔ اس کی ساڑی بے ترتیب تھی۔ بال کھلے ہوئے، ماتھے کا ٹیکا بکھرا ہوا اور وہ رو رو کر چلا رہی تھی۔ میں آگے بڑھی۔ اس کو بٹھایا اور پانی پلانے کی کوشش کی۔ وہ مجھے دیکھ کر زور زور سے رونے لگی۔ میں نے پانی پلاتے ہوئے اسے شانت رہنے کو کہا۔ اس کے بکھرے بالوں کو سلجھایا اور گلاس سے پانی نکال کر منہ دھویا۔ اس کے ہاتھ پر بندیا ٹھیک سے لگادی اور بہت ہی پیار اور اپنائیت سے کھانا کھلانے لگی۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھنے لگی اور کہنے لگی "دیدی! آپ کو دیکھ کر اور آپ کا پیار بھرا برتاؤ دیکھ کر دل میں آتا ہے کہ اپنی آپ بیتی آپ کو سنا کر میں اپنا من ہلکا کر دوں۔ کیا میں آپ کو سب کچھ بتا سکتی ہوں؟"

میں نے اشارے سے اپنی رضامندی دیدی۔

کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے اپنی آپ بیتی سنانی شروع کر دی۔

اس دن میں اپنے کمرے میں امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔ دو لوگ میرے کمرے میں

گھس آئے۔ دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ میں نے ان کا ارادہ بھانپ لیا۔ ٹیبل پر رکھے لیمپ سے حملہ کیا اور جو چیز ہاتھ میں آتی گئی پھینکتی گئی۔ لیکن کچھ دیر کی لڑائی کے بعد وہ دونوں مجھ پر حاوی ہوگئے۔ میرے جسم اور من کو روند دیا۔ میں جسمانی تکلیف، ذہنی تناؤ سے بے ہوش ہو گئی۔

جب آنکھ کھلی تو کھلا ہوا دروازا اور کمرے میں اندھیرا دیکھا۔ یونہی لنگڑتی لنگڑتی میں دروازہ کے پاس آئی۔ آواز سن کر ٹھنک گئی۔ جانی پہچانی سی آواز تھی۔ دروازے سے جھانک کر دیکھا......"

مالتی کی آواز ٹوٹ رہی تھی...... میں نے اس کو پانی پلایا اور پیٹھ سہلانے لگی۔

"ہاں، ان دونوں میں سے ایک وہ تھا جس نے میری روح اور جسم کو روندا تھا۔ اس نے بٹوے میں سے ڈھیر سارے ہرے نوٹ میری ماں کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا "مزہ آگیا آنٹی" اور میری ماں نے ہنستے ہنستے وہ سارے نوٹ لے لیے اور کہا "جب ضرورت پڑے نوٹ لے آنا"۔

اس وقت میری ماں سبزی کاٹ رہی تھی چھری سے۔ اور وہ ہنس رہی تھی...... میں کمرے سے اسی بکھری حالت میں بھاگی، چھری ہاتھ سے چھین کر بس دس پندرہ نہ جانے کتنے بار اس کے پیٹ میں چھری گھساتی گئی اور اس کے کوکھ کو چھلنی چھلنی کر دیا اور بے ہوش ہو گئی۔ پھر پولیس تھانہ، کورٹ اور اب جیل میں"۔

"مجھے ذرا بھی افسوس نہیں جو کچھ میں نے کیا"۔ وہ تھک گئی تھی۔ اس نے اشارے سے کہا، میں نے اسے لیٹنے میں مدد کی۔ کمبل اوڑھایا اور اس کو تکتی رہی۔ اس کے چہرے پر کوئی ملال، پچھتاوا نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر سکون تھا۔ گہری شانتی تھی۔

میں من ہی من سوچنے لگی ہر انسان اپنے آپ میں ہی ایک الگ دنیا ہوتا ہے۔ الگ الگ رائے، مقصد، اصول لے کر جیتا مرتا ہے۔ ایک ماں نے پاروتی دیوی نے اپنی بیٹی کی عصمت بچانے کے لیے، اس کا مستقبل سنوارنے کے لیے اپنے پتی کا قتل کر دیا اور اس بات کا اسے ذرا بھی پچھتاوا نہیں اور عمر بھر قید کی سزا بھگت رہی ہے۔

ایک بیٹی کی عزت کا سودا اس کی ماں نے ہی کیا۔ اور بیٹی نے اس ماں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

دو ماں دو الگ الگ سنسکار! انسانی ذہن کی گہرائی کو پانا کتنا مشکل کام ہے!



نئے رِشتے

وہ سفید شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ سفید موتیوں کا ہار جو امریکن ہیروں سے جڑا ہوا تھا، اس کے گلے میں بج رہا تھا۔ چوڑیوں، انگوٹھیوں نے میرا دھیان کھینچا تھا۔

وہ چالیس پچاس کے عمر کی، متوسط قد کی، جسم نہ زیادہ موٹا نہ بہت پتلا، سانولا رنگ تھا اس کا، آنکھوں میں کاجل، آنکھیں گہری کالی، جاندار، چنچل، آنکھوں کی بھنویں کمان کی طرح، جسم غیر معمولی چنچل۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ فطرتاً مسکان کے جواب میں مسکان ہی ملتی ہے۔ مجھے بھی اس کا جواب مسکان میں ملا۔ وہ میری طرف آئی اور کہنے لگی "آپ کی مسکان میں مقناطیس سی کشش ہے"۔ میں نے اس کی بات پر ایک قہقہہ مارا۔

کبھی کبھی میں کسی کی بات کا جواب قہقہہ مار کر دیتی ہوں جو صرف سمجھدار ہی سمجھ جاتا ہے۔ ست سنگ کے ماحول میں اگر بتی، دیا، پر سکون ماحول تھا۔ جس میں مجھے اس سے باتیں کرنے میں سنتوش اور خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔

میں نے بہت پیار اور اپنائیت سے اس کا نام پوچھا، اس نے مسکرا کر جواب دیا "منجو"۔ مجھے اس کا نام بہت ہی میٹھا اور کومل لگا۔

میں نے اس کے گھر کا پتہ پوچھ لیا۔ میرے گھر کے آدھے فاصلے پر تھا۔ سو ہم ایک ہی رکشا میں سوار ہوئیں۔ جب اس کا گھر قریب آیا تو اس نے دس کا نوٹ میری ہتھیلی پر دھر دیا۔ "بھئی یہ کیا ہے؟"، "آدھے راستے کا کرایہ"۔ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا "یہ پہلی بار ہے، دوسری بار تم دے دینا"۔

ایک ہفتے کے لیے کسی وجہ سے میں میکے چلی گئی اور منجو سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اور پھر باقاعدہ ست سنگ شروع ہو گیا۔ اس نے کسی دن اپنے گھر آنے کو کہہ دیا، سو ایک فرصت بھرے دن میں اس کے گھر چلی گئی۔

کسی بھی انسان کی اصلیت جاننے کے لیے مجھے اسی کے گھر میں جانا ضروری لگتا ہے۔

گھر کا دروازہ منقش تھا۔ گنیش جی کی مورتی، چمکتا ہوا 'اوم' اور اس کے نیچے جھولے لال کی مورتی دیکھ کر میں مسکرائی اور کہا "منجو، تم تو پوری سندھی ہو۔ وہ مسکرا کر خاموش ہی رہی۔ اس نے چابی سے دروازہ کھول دیا۔ اس کا مطلب ہوا اندر کوئی نہیں تھا۔ کون ہوں گے ان کے پریوار میں؟

دروازہ کھولتے ہوئے اس نے کہا کوئی نہیں رہتا میرے ساتھ۔ اس گھر میں میں اکیلی ہی رہتی ہوں۔ میں چونک گئی۔ اس نے میرے خاموش سوال کا جواب کیسے دیدیا؟

صوفے پر بیٹھنے پر اصرار کیا۔ وہ خود رسوئی گھر میں چلی گئی۔

ہال میں ایک چھوٹا سا مندر تھا، جس میں کئی مورتیاں تھیں۔ خاص کر کرشنا، رادھا، میرا کی۔ ایک دیپک جل رہا تھا اور اگربتی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اگربتیاں جل کے راکھ بن چکی تھیں۔ دیوتاؤں پر پھول چڑھائے ہوئے تھے۔ منجو سویرے سویرے پوجا بھی کرتی ہے؟ ایک لال گٹھری میں کچھ گرنتھ بندھے ہوئے تھے...... میں نے منجو سے اجازت لے لی کہ وہ لال گٹھری کھول کر دیکھنے لگی۔

گٹھری کے اندر شری بھد بھاگوت گیتا، سکھ منی، مہابھارت، راماین اور جپ صاحب وغیرہ گرنتھ بندھے ہوئے تھے۔

کون پڑھتا ہوگا یہ گرنتھ؟ میں نے من میں سوچا "میں پڑھتی رہتی ہوں روز، صبح اور رات کو، تن من، آتما کو شانت کرنے کے لیے"۔

میں چونک گئی۔ وہ لال گٹھری میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں نے اس سے پوچھ ہی ڈالا "منجو جو بات، جو سوال میں اپنے من میں سوچتی ہوں، تم اس سوال کو کیسے پڑھ لیتی ہو اور جواب دیدیتی ہو؟"

"آپ کی آنکھیں دیدی، جن میں تجسس، دلچسپی، کچھ جاننے کی گہری خواہش آنکھوں میں پوری طرح سے سوال اُبھر آتے ہیں۔ آپ کا چہرہ کوئی بھی بھانپ سکتا ہے"۔ میں اس کا جواب سن کر ہنس پڑی۔

اس کے ہاتھ میں ایک چاندی کی ٹرے تھی اور اس میں ایک خوبصورت چاندی کا گلاس تھا جس میں شربت تھا۔ اور چاندی کی پلیٹ میں نمکین بھی تھا۔ کھاتے پیتے میں نے اس سے پوچھ ہی ڈالا "تم اکیلی کیوں رہتی ہو؟ تمہارے پریوار میں اور کون کون ہے؟"

"میرا بیٹا، بہو اور پوتا...... میرے پتی کا انتقال ایک کار ایکسیڈنٹ میں ہوا، تب میرا بیٹا صرف بارہ سال کا تھا" اس نے جواب دیا۔ میں نے خاموشی سے دلاسہ دیتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور پھر وہ اپنے آپ کو روک نہ سکی، سسکیاں بھرتی ہوئی، وہ روتی رہی، روتی ہی رہی...... کچھ لمحے میں نے اسے رونے دیا پھر پانی کا گلاس لانے کے لیے میں کچن کی طرف چلی گئی۔ پانی کا گلاس بھر کے میں اسے اپنے ہی ہاتھوں سے گھونٹ گھونٹ، دھیرے دھیرے پینے کو کہا۔

ہچکیوں اور سسکیوں کے بیچ وہ کہتی رہی "دیدی، میری زندگی تباہ ہو گئی ہے۔ میں کہیں کی نہیں رہی۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہی، جی کرتا ہے خودکشی کرلوں"۔

میں نے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا "پگلی خودکشی کی باتیں نہ کر۔ خودکشی تو بزدل، کمزور اور سامنے آئی ہوئی پریشانیوں کا سامنا نہ کرنے والے کرتے ہیں، جسم تو مندر ہے، جس میں خود بھگوان رہتے ہیں۔ تم کمزور نہیں ہو، ایک بیوہ ہوتے ہوئے بھی تم نے اپنے بیٹے کو پال پوس کر، اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔ اب وہ اپنے پریوار کے ساتھ رہ رہا ہے۔ الگ کیوں رہ رہا ہے......؟"

"دیدی، میں اس وقت ان سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔ کسی دن ضرور دوں گی"۔
اب وہ پرسکون تھی لیکن نڈھال بھی تھی۔

میں نے رسوئی گھر میں جا کر چائے بنائی اور ہم دونوں چائے پینے لگیں۔

میں نے اسے یاد دلایا، "منجو میں تو تمہارے ہاتھوں سے بنی ہوئی مورتیاں اور دیپک دیکھنے اور خریدنے آئی ہوں۔ کیا تم بھول گئیں؟ چلو اُٹھو...... وہ معافی مانگتے ہوئے کہنے لگی...... دیدی! میں نے بھول ہی گئی۔ ابھی لاتی ہوں"۔ وہ اندر چلی گئی۔

میں سوچنے لگی ایسا کیا ہوگا منجو کی زندگی میں کہ وہ خود کشی کرنے تک کا سوچ رہی ہے؟

منجو ایک باکس میں مورتیاں اور بہت خوبصورت دیپ لے آئی۔ رادھا، میرا، کرشنا، گنیش کی اور لکشمی کی مورتیاں گھڑی تھیں اس نے جو بہت ہی خوبصورت تھیں۔ مورتیوں کے چہرے بہت خوبصورت تھے۔ ان میں سے میں نے کچھ رکھ لیے۔ باقی اسے لوٹاتے ہوئے کہا "منجو...... تم نے تو بے جان مورتیوں میں جان پھونک دی ہے۔ کمال ہے، تمہاری کلا کا اور ہاتھوں کا"۔

میں نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا، رات ہونے آئی تھی۔ میں نے منجو کو کہا، چلو آج چلتی ہوں، پھر کبھی ملیں گے بہت دیر ہو رہی ہے۔ وہ مجھے چھوڑنے نیچے آگئی۔ ہم نے مسکرا کر ایک دوسرے سے وداع لی۔

گھر آنے پر خط حاصل ہوا۔ دہلی سے میرے پریوار سے۔ مئی مہینے کی چھٹیاں بتانے پونہ آرہے ہیں۔ میرے بچوں کو بھی چھٹیاں مل گئی تھیں۔ سو ایک سوا مہینہ چھٹیوں میں بیت گیا۔ ست سنگ وغیرہ بھی چھوٹ گیا تھا۔ ماتھیران، مہابلیشور، لوناولہ، ممبئی گھوم کر آئے۔ یہ چھٹیاں بہت اچھی بیت گئیں۔

ایک دن کوریئر والے نے لفافہ تھما دیا۔ نام اور پتہ دیکھ کر میں چونکی۔ لفافہ دیکھ کر میں اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ اندر سے کڑی لگا کر، پلنگ پر لیٹ گئی۔ خط منجو کا تھا، جو ناگپور سے لکھا گیا تھا۔

خط کا مضمون تھا، ہماری جب ملاقات ہوئی تو ایک سوال پوچھا تھا۔ تم اکیلی کیوں رہتی ہو منجو، اپنے بہو بیٹے کے ساتھ کیوں نہیں رہتی ہو؟

دیدی، میں پوچھتی ہوں دیدی، کیا دو سوتن ایک ہی گھر میں ایک ہی چھت کے نیچے رہ سکتی ہیں؟ آپ چونک گئی؟ ہاں میری بہو .ور میرے ساتھ سوتن جیسا برتاؤ کرتی تھی۔ یہ بہت بڑا الزام میری بہو نے مجھ پر لاد دیا تھا۔

میرا بیٹا مجھے بہت چاہتا تھا اور بہت ہی عزت کرتا تھا۔ بیوہ ماں نے جی جان کی بازی لگا کر اپنے خون سے اس کی زندگی کا پودھا سینچا تھا۔

وہ تو شادی کرنے کو قطعی تیار نہیں تھا۔ میں اپنی ماں کی خدمت کروں گا۔ اس کے

قدموں میں پڑار ہوں گا۔ ایسا قطعی فیصلہ کیا تھا میرے بیٹے انوپ نے۔ گڑگڑا کے میں نے ہی اسے مَنایا تھا۔ باولا! ہر وقت میرے ارد گرد ہی منڈراتا رہتا تھا۔ بخار ہوتا یا میری طبیعت تھوڑی بھی خراب ہوتی رات رات بھر سرہانے بیٹھ کر سر دباتا، پاؤں دباتا رہتا تھا۔ شادی سے پہلے ہم ماں بیٹے کی زندگی ایک دوسرے کی دیکھ بھال اور بہت ہی پیار، چاہت میں بیتی تھی۔ میں بھی اس کی تھوڑی سی بیماری میں دن رات ایک کر کے اس کی خدمت کرتی رہتی تھی اور شادی کے بعد بھی ہمارا ویسا ہی برتاؤ چلتا رہا جو بہو کو اکھرنے لگا۔ میکے میں ماں باپ، چھ سات بھائی بہن اور بھائی ہاسٹل میں اور بہنیں بھی ہاسٹل میں رہنے سے اسے ہمارا گھریلو اور اپنائیت اور ماحول پلّے نہیں پڑتا۔ اس نے غصے میں آکر جھگڑتے جھگڑتے مجھے سوتن کہہ دیا اور بعد میں اپنے گھر والوں اور دوستوں میں بھی ایسی افواہ پھیلا دی۔

دل پر پتھر رکھ کر میں نے انھیں الگ مکان لے کر دیا۔ اکیلی رہنے لگی۔ میرا بیٹا میرے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ اکثر میرا اکیلا پن دور کرنے کے لیے کبھی کبھی بیٹے یعنی میرے پوتے کو بھی لانے لگا۔ پوتے میں میری جان اٹک گئی۔ وہ بھی ضد کر کے دادی کے پاس آنے کی کوشش کرتا۔ پھر میری بہو نے طلاق کی دھمکی دی۔ اور میرے بیٹے اور میرے تعلقات کو جسمانی اور نہ جانے کیسی کیسی الول فلول باتوں سے بدنام کرتی رہی۔

اپنے بیٹے اور پوتے کی بھلائی کے لیے میں نے شہر چھوڑ دیا ہے۔ اب پرسوں میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں یتیم بچوں کی صدر معلّمی کی نوکری شروع کرنے جارہی ہوں ...... اس کا پتہ میں کسی کو بھی نہیں دینا چاہتی۔ بھگوان کرے میرا بیٹا اور اس کا گھرانہ پھلے پھولے۔

ایک ہی شہر میں رہ کر میری بہو کی سوچ، تہذیب، برتاؤ اور اس کے اُڑائے ہوئے افواہوں کا مرتے دم تک انکار کرتے رہنا، یہ سب ناممکن ہوتا جارہا تھا۔ میں اپنی وجہ سے ایک پریوار توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ باقی راستے خودکشی، بوڑھوں کے ہاسٹل میں رہنا، کسی ست سنگ کے آشرم میں رہنا، مجھے ٹھیک نہیں لگا۔ باقی بچی ہوئی زندگی ان یتیم بچوں میں اپنا پیار، ممتا دے کر، اچھے اخلاق دے کر، محبت دے کر، بے غرض محبت لے کر، خوبصورت زندگی جینے کا فیصلہ میں نے لیا ہے۔ آج میں گہری شانتی، سکون، سکھ کا احساس محسوس کر رہی ہوں۔

میں نے خط پڑھ لیا۔ تھوڑے وقت کے لیے آنکھیں موندے شانت لیٹی رہی۔ پھر اُٹھ کر تھوڑی فریش ہو گئی۔ کمرے سے نکل کر رسوئی میں گھس گئی۔ بچے پیٹ میں چوہے دوڑنے کا ہلا مچانے لگے۔

آنکھوں کے سامنے منجو کا شانت، سمادھانی، کرم یوگنی سا چہرہ گھومنے لگا۔ صحیح فیصلہ لینے والی، اپنی زندگی کی صحیح قیمت لگانے والی منجو کے لیے میرا من عقیدت سے بھر گیا۔



